۲۶

الشّعرآء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ — سورۂ فرقان — کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا اثبات ہے لیکن نہج استدلال اور اسلوبِ بیان اس کا سابق سورہ سے مختلف ہے۔

سابق سورہ میں جن انبیائے کرام کی سرگزشتوں کی طرف اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا اس میں ان کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قریش کاہن اور شاعر ہونے کا جو الزام لگاتے تھے اس میں اس الزام کی خاص طور پر تردید فرمائی ہے۔

اس میں ہر پیرے کے بعد آیات اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ۝ بطور ترجیع آٹھ بار وارد ہوئی ہیں۔ اس ترجیع سے معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے آپ سے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے وہ اس میں خاص طور پر مخاطب ہیں۔ ان کو تاریخ کے حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ رسولوں اور ان کے مکذبین کی تاریخ سے سبق لیں۔ ان لوگوں کی روش کی تقلید نہ کریں جو خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے تاکہ عمود کے ساتھ اس کے مختلف اجزا کا تعلق اور اس کا مجموعی ربط و نظام اچھی طرح واضح ہو جائے۔

(۱ - ۹) تمہید، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر قرآن کے مخالفین اس پر ایمان نہیں لا رہے ہیں، کسی نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں تو آپ اس چیز سے پریشان نہ ہوں۔ اگر اللہ چاہے گا تو کوئی ایسی نشانی اتار دے گا جو ان سب کی گردنیں قرآن کے آگے جھکا دے گی لیکن قرآن کی صداقت کسی خارجی نشانی کی محتاج نہیں ہے۔ یہ اپنی صداقت کی دلیل خود اپنے اندر ہی رکھتا ہے۔ اگر یہ لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو جن خطرات سے

قرآن ان کو آگاہ کر رہا ہے وہ سب ایک ایک کر کے پیش آ کر رہیں گے۔ اس کائنات میں نشانیوں کی کمی نہیں ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کے لیے کوئی نشانی کارگر نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کو خدا جب چاہے پکڑ سکتا ہے، وہ عزیز وغالب ہے، کوئی اس کے ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا لیکن وہ نہایت رحیم بھی ہے اس وجہ سے لوگوں کی سرکشی کے باوجود ان کو مہلت دیتا ہے۔

(۱۰-۶۸) حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی سرگزشت جس میں وہ واقعات اجمالاً بیان ہوئے ہیں جو فرعون کے پاس جانے کے حکم سے لے کر اس کی غرقابی تک پیش آئے۔ سرگزشت کے آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۶۹-۱۰۴) حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوتِ توحید کا حوالہ جو انھوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کو دی۔ اسی ذیل میں ان لوگوں کے انجام کا بیان ہے جو اپنے مزعومہ شرکاء و شفعاء کے بل پر آخرت سے بے پروا ہیں۔ آخر میں آیاتِ ترجیع ہیں۔

(۱۰۵-۱۲۲) حضرت نوحؑ کی دعوت اپنی قوم کو اور قوم کا متکبرانہ جواب اور انجام کار اس کی غرقابی۔ آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۲۳-۱۴۰) حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت اپنی قوم عاد کو۔ قوم کی طرف سے ان کی متکبرانہ تکذیب اور اس کے نتیجہ میں عذابِ الٰہی کا ظہور — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۴۱-۱۵۹) حضرت صالحؑ کی دعوت قوم ثمود کو، قوم ثمود کی تکذیب اور اس کا انجام — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۶۰-۱۷۵) حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کا رویہ اور اس کا انجام — آخر میں آیاتِ ترجیع۔

(۱۷۶-۱۹۱) حضرت شعیب علیہ السلام اور ان کی دعوت کے ساتھ اہلِ مدین کا سلوک اور بالآخر ان کا حشر۔ اس سرگزشت کے آخر میں بھی انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔

(۱۹۲-۲۲۷) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون کی پوری وضاحت فرما دی گئی ہے۔ اس کی تفصیلات تفسیر میں آئیں گی۔ یہاں اجمالاً مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھیے۔

(ا) قرآن کا منبع وحیِ الٰہی ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت روح الامین کے ذریعہ سے آنحضرتؐ پر نازل فرمایا ہے۔

(ب) اس کا عربیِ مبین میں نازل ہونا اہلِ عرب پر اللہ تعالیٰ کا ایک عظیم احسان ہے۔ اگر انھوں نے اس کی قدر نہ کی تو یہ ان کی انتہائی محرومی و بدبختی ہے۔

(ج) اس کے دلائل پچھلے انبیاءؑ کے صحیفوں میں موجود ہیں اور علمائے اہلِ کتاب ان سے واقف ہیں۔

(د) یہ کفار کے لیے انذار و تنبیہ ہے تاکہ مواخذہ سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیا جائے تو جو لوگ اس کی تکذیب پر اڑے ہوئے ہیں وہ اس کے نتائج دور تک سوچ لیں۔

(ھ) اس کو جنوں اور شیطانوں کی وحی قرار دینا محض خود باختگی ہے۔ شیاطین جس قسم کے لوگوں پر اترتے ہیں ان کی علامات کی طرف اشارہ۔

(و) یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے بلکہ اللہ کا کلام ہے۔ قرآن اور شعر، پیغمبر اور شاعر میں امتیاز کرنے والی بعض کسوٹیوں کی طرف اشارہ۔

سُوْرَةُ الشُّعَرَآءِ (۲۶)

مَكِّيَّةٌ —— اٰيَاتُهَا ۲۲۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۹

طٰسٓمّٓ ﴿۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۲﴾ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۳﴾ اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ ﴿۴﴾ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمٰنِ مُحْدَثٍ اِلَّا كَانُوْا عَنْهُ مُعْرِضِيْنَ ﴿۵﴾ فَقَدْ كَذَّبُوْا فَسَيَاْتِيْهِمْ اَنْۢبٰٓؤُا مَا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۶﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الْاَرْضِ كَمْ اَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ ﴿۷﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۹﴾

ع ۵

ترجمۂ آیات ۱-۹

یہ طٰسٓمّٓ ہے۔ یہ واضح کتاب کی آیات ہیں۔ شاید تم اپنے آپ کو اس فکر میں ہلاک کر کے رہو گے کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں بنتے! اگر ہم چاہیں تو ان پر آسمان سے کوئی نشانی اتار دیں پس ان کی گردنیں اس کے آگے جھکی ہی رہ جائیں۔ اور ان کے پاس خدائے رحمان کی طرف سے جو تازہ یاددہانی بھی آتی ہے یہ اس سے اعراض کرنے والے ہی بنے رہتے ہیں۔ سو انھوں نے جھٹلا دیا تو جس چیز کا یہ مذاق اڑاتے رہے ہیں اب اس کی تنبیہات ان کے آگے

ظاہر ہوں گی۔ ۱-٦

کیا انھوں نے زمین کی طرف نگاہ نہیں کی! ہم نے اس میں کتنی نوع بنوع کی فیض بخش چیزیں اگا رکھی ہیں! اس میں بے شک بہت بڑی نشانی ہے لیکن ان میں سے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تمہارا رب غالب بھی ہے، مہربان بھی۔ ۷-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

طٰسٓمّٓ (۱)

'طٰسٓمّٓ' ہمارے نزدیک مبتدائے محذوف کی خبر ہے۔ ہم نے ترجمہ میں یہ محذوف کھول دیا ہے۔ یعنی یہ سورۂ 'طٰسٓمّٓ' ہے۔

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ (۲)

آفتاب آمد دلیل آفتاب!

'کتاب مبین' سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس نے نہایت فصیح و بلیغ زبان میں اپنی دعوت کے ہر پہلو کو گوناگوں اسلوبوں سے بالکل مدلل و مبرہن کر دیا ہے۔ قرآن کی اس صفت کے ذکر سے یہاں مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ جو کتاب لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ اپنی صحت و صداقت کی خود سب سے بڑی دلیل ہے۔ کسی خارجی شہادت کی محتاج نہیں ہے اس وجہ سے جو لوگ اس کی تصدیق کے لیے کسی معجزہ یا نشانی عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں ان کا مطالبہ درخور اعتناء نہیں ہے، آپ اس کی پروا نہ کریں۔ آفتاب اپنی دلیل خود ہوتا ہے۔ اس پر خارج سے کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی۔

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (۳)

دل نواز تسلی

وہی تسلی کا مضمون جو اوپر والی آیت میں مخفی تھا اس آیت میں نہایت دل نواز پیرائے میں واضح ہو گیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوا ہے کہ ان لوگوں کا اس 'کتاب مبین' پر ایمان نہ لانا آپ کے دل پر اتنا شاق ہے کہ معلوم ہوتا ہے آپ اس غم میں اپنے کو ہلاک کر کے رہیں گے حالانکہ قصور نہ آپ کا ہے نہ اس کتاب کا، سارا قصور ان لوگوں کا خود اپنا ہے کہ ایک بالکل واضح حقیقت کو جھٹلانے کے لیے مختلف قسم کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔ آپ کی ذمہ داری صرف تبلیغ ہے۔ اس کا حق آپ نے پورا پورا ادا کر دیا اور ادا کر رہے ہیں، پھر ایسے ناقدروں کے پیچھے آپ اپنے کو کیوں ہلکان کریں!

اِنْ نَّشَاْ نُنَزِّلْ عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ اٰيَةً فَظَلَّتْ اَعْنَاقُهُمْ لَهَا خٰضِعِيْنَ (۴)

آیت میں بظاہر 'خٰضِعِیْنَ' کی جگہ 'خَاضِعَۃً' ہونا تھا لیکن 'اَعْنَاقُھُمْ' میں مضاف الیہ کی رعایت سے 'خٰضِعِیْنَ' آیا ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ اس کی بعض مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں۔

عربیت کا ایک اسلوب

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی کے ساتھ کفار کے لیے دھمکی بھی مضمر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اس کتاب پر ایمان لانے کے لیے کوئی نشانی دیکھنے ہی پر اڑے ہوئے ہیں تو یاد رکھیں کہ ہمارے پاس نشانیوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم جب چاہیں آسمان سے کوئی ایسی نشانی اتار سکتے ہیں جس کے آگے سب کی گردنیں جھک جائیں لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہ سوچ سمجھ کر اپنے اختیار و ارادہ سے ایمان لائیں۔ ہمارے ہاں معتبر ایمان وہی ہے جو اختیار و ارادہ کے ساتھ لایا جائے نہ کہ مجبور ہو کر۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی ہے کہ جب ایمان کے باب میں سنتِ الٰہی یہ ہے تو آپ ان لوگوں کے مطالبات سے پریشان کیوں ہوں، ان کے معاملے کو خدا پر چھوڑ دیں!

پیغمبر کے لیے تسلی اور مخالفین کے لیے تہدید

وَمَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّنَ الرَّحْمَٰنِ مُحْدَثٍ إِلَّا كَانُوا عَنْهُ مُعْرِضِينَ ه فَقَدْ كَذَّبُوا فَسَيَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (۵-۶)

یہ ذرا مختلف الفاظ میں وہی مضمون ہے جو سورۂ فرقان کی آخری آیت میں گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تذکیر و تعلیم کے اس سارے اہتمام سے، جو ربِ رحمان نے ان کے لیے کیا، مقصود یہی تھا کہ یہ لوگ سوچیں سمجھیں اور زندگی کی صحیح روش اختیار کریں لیکن ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ جتنی ہی ان کے علاج کی تدبیر کی گئی اتنی ہی دوا اور طبیب سے ان کی نفرت بڑھتی گئی۔ اللہ نے تازہ بتازہ، نو بنو اسلوبوں سے ان کو یاد دہانی کی لیکن وہ اعراض کرنے والے ہی بنے رہے اور قرآن و رسول دونوں کا انھوں نے مذاق اڑایا۔ ان کی اس روش کے بعد اب ان کے لیے اس کے سوا کوئی چیز بھی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ جس قرآن کا انھوں نے اب تک مذاق اڑایا ہے، اس نے جن نتائج سے ان کو خبردار کیا ہے وہ ایک ایک کر کے ان کے سامنے آئیں۔ چنانچہ وہ ان کے سامنے آئیں گے۔

دوا سے مریض کی بیزاری اور اس کا انجام

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الْأَرْضِ كَمْ أَنبَتْنَا فِيهَا مِن كُلِّ زَوْجٍ كَرِيمٍ (۷)

'زَوْجٌ' کے معنی قسم اور نوع کے ہیں۔ 'مِنْ كُلِّ زَوْجٍ' یعنی نوع بنوع چیزیں۔ 'كَرِيمٍ' یہاں فیض بخش اور منفعت رساں کے مفہوم میں ہے۔ اہلِ عرب انگور کو 'کَرْم' کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نام انھوں نے انگور کی غایت درجہ منفعت رسانی ہی کی وجہ سے رکھا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ آسمان سے اترنے والی کسی نشانیِ عذاب ہی کے منتظر کیوں ہیں؟ اس زمین پر پھیلی ہوئی ان گوناگوں نعمتوں کو کیوں نہیں دیکھتے جن کو ربِ رحیم و کریم نے اسی لیے پیدا کیا ہے کہ لوگ ان سے فائدہ بھی اٹھائیں اور بصیرت و یاددہانی بھی حاصل کریں!

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿﴾ وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۸-۹)

یعنی اگر یہ کسی نشانی ہی کے طالب ہیں تو اس سے بڑی نشانی اور کیا چاہیے! یہاں ان تمام دلائل توحید و قیامت و جزا کو ذہن میں مستحضر کر لیجیے جو قرآن میں تفصیل سے مذکور ہوئے ہیں اور جن کی شہادت میں قرآن نے زمین کی انہی نعمتوں اور برکتوں کا حوالہ دیا ہے۔ آگے سورۂ لقمان کی آیت ۱۰ اور سورۂ سجدہ کی آیت ۲۷ کے تحت اس مضمون کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

'وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَ' یعنی یہ بات نہیں ہے کہ نشانیوں کی کمی ہے۔ نشانیوں سے تو اس زمین کا چپہ چپہ معمور ہے لیکن جو لوگ ایمان نہیں لانا چاہتے ان کا کیا علاج!

خدائے عزیز و رحیم کی سنتِ امہال

'وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ' یہ وہی اوپر والی بات اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات کی روشنی میں واضح فرمائی ہے کہ تمھارا خداوند عزیز بھی ہے اور ساتھ ہی رحیم بھی۔ 'عَزِیْزٌ' یعنی غالب، وہ جو چاہے کر سکتا ہے کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ اگر وہ ان پر فوراً کوئی عذاب نازل کر دے تو کوئی اس کی پکڑ سے ان کو بچا نہ سکے گا، لیکن وہ رحیم بھی ہے اس وجہ سے عذاب بھیجنے میں جلدی نہیں کرتا کہ جو لوگ توبہ اور اصلاح کرنی چاہیں وہ اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر لیں اور اس کی رحمت کے سزاوار بن جائیں۔ یہاں مبتدا کے اعادہ سے مقصود خاص طور پر ان صفات پر زور دینا اور لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرنا ہے اس لیے کہ خدا کی ان صفات کو مستحضر نہ رکھنے ہی کے باعث نادانوں کو یہ مغالطہ پیش آیا کہ وہ خدا کی ڈھیل کو اپنے رویہ کی صحت و صداقت کی دلیل سمجھ بیٹھے اور نہایت غرور کے ساتھ ان لوگوں کا مذاق اڑایا جنھوں نے ان کو اصلاح کی دعوت دی ——— یہ آیات اس سورہ میں، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بار بار آئیں گی اس وجہ سے ان کے مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے تاکہ آگے اس کے اعادہ کی ضرورت نہ پیش آئے۔

۲- آگے کا مضمون ——— آیات ۱۰-۶۸

حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کی وہ سرگزشت جس کی طرف پچھلی سورہ میں اجمالی اشارہ فرمایا گیا تھا، تفصیل کے ساتھ آ رہی ہے۔ یہ سرگزشت اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ہوا ہے اور پھر فرعون اور اس کی فوج کی غرقابی پر ختم ہوتی ہے۔ اس دور کے تمام اہم واقعات کی طرف اس میں اشارے ہیں۔ یوں تو اس سرگزشت کا ہر حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کے لیے بھی سرمایۂ تسکین و تسلی اور آپؐ کے مخالفین کے لیے سبق آموز ہے لیکن سورہ کے عمود کے پہلو سے خاص چیز جو اس میں قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ اغراض و شہوات کے غلام بن کر اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ضائع کر بیٹھتے ہیں ان پر کوئی بڑے سے

بڑا معجزہ بھی کچھ کارگر نہیں ہوتا۔ ان کی آنکھیں صرف اس وقت کھلتی ہیں جب ان کا انجام ان کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰-۶۸

وَإِذْ نَادَىٰ رَبُّكَ مُوسَىٰ أَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿۱۰﴾ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۚ أَلَا يَتَّقُونَ ﴿۱۱﴾ قَالَ رَبِّ إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ ﴿۱۲﴾ وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي فَأَرْسِلْ إِلَىٰ هَارُونَ ﴿۱۳﴾ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ﴿۱۴﴾ قَالَ كَلَّا ۖ فَاذْهَبَا بِآيَاتِنَا ۖ إِنَّا مَعَكُمْ مُسْتَمِعُونَ ﴿۱۵﴾ فَأْتِيَا فِرْعَوْنَ فَقُولَا إِنَّا رَسُولُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿۱۶﴾ أَنْ أَرْسِلْ مَعَنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۱۷﴾ قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ ﴿۱۸﴾ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ ﴿۱۹﴾ قَالَ فَعَلْتُهَا إِذًا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ ﴿۲۰﴾ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿۲۱﴾ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ ﴿۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿۲۳﴾ قَالَ رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ مُوقِنِينَ ﴿۲۴﴾ قَالَ لِمَنْ حَوْلَهُ أَلَا تَسْتَمِعُونَ ﴿۲۵﴾ قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ آبَائِكُمُ الْأَوَّلِينَ ﴿۲۶﴾ قَالَ إِنَّ رَسُولَكُمُ الَّذِي أُرْسِلَ إِلَيْكُمْ لَمَجْنُونٌ ﴿۲۷﴾ قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ ﴿۲۸﴾ قَالَ لَئِنِ اتَّخَذْتَ إِلَٰهًا غَيْرِي لَأَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُونِينَ ﴿۲۹﴾ قَالَ أَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَيْءٍ

مُّبِينٍ ﴿٣٠﴾ قَالَ فَأْتِ بِهِۦٓ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٣١﴾ فَأَلْقَىٰ
عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ ثُعْبَانٌ مُّبِينٌ ﴿٣٢﴾ وَنَزَعَ يَدَهُۥ فَإِذَا هِىَ
بَيْضَآءُ لِلنَّٰظِرِينَ ﴿٣٣﴾ قَالَ لِلْمَلَإِ حَوْلَهُۥٓ إِنَّ هَٰذَا لَسَٰحِرٌ
عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ يُرِيدُ أَن يُخْرِجَكُم مِّنْ أَرْضِكُم بِسِحْرِهِۦ فَمَاذَا
تَأْمُرُونَ ﴿٣٥﴾ قَالُوٓا۟ أَرْجِهْ وَأَخَاهُ وَٱبْعَثْ فِى ٱلْمَدَآئِنِ
حَٰشِرِينَ ﴿٣٦﴾ يَأْتُوكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيمٍ ﴿٣٧﴾ فَجُمِعَ ٱلسَّحَرَةُ
لِمِيقَٰتِ يَوْمٍ مَّعْلُومٍ ﴿٣٨﴾ وَقِيلَ لِلنَّاسِ هَلْ أَنتُم مُّجْتَمِعُونَ ﴿٣٩﴾
لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ ٱلسَّحَرَةَ إِن كَانُوا۟ هُمُ ٱلْغَٰلِبِينَ ﴿٤٠﴾ فَلَمَّا جَآءَ
ٱلسَّحَرَةُ قَالُوا۟ لِفِرْعَوْنَ أَئِنَّ لَنَا لَأَجْرًا إِن كُنَّا نَحْنُ
ٱلْغَٰلِبِينَ ﴿٤١﴾ قَالَ نَعَمْ وَإِنَّكُمْ إِذًا لَّمِنَ ٱلْمُقَرَّبِينَ ﴿٤٢﴾ قَالَ
لَهُم مُّوسَىٰٓ أَلْقُوا۟ مَآ أَنتُم مُّلْقُونَ ﴿٤٣﴾ فَأَلْقَوْا۟ حِبَالَهُمْ وَ
عِصِيَّهُمْ وَقَالُوا۟ بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ ٱلْغَٰلِبُونَ ﴿٤٤﴾ فَأَلْقَىٰ
مُوسَىٰ عَصَاهُ فَإِذَا هِىَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ ﴿٤٥﴾ فَأُلْقِىَ ٱلسَّحَرَةُ
سَٰجِدِينَ ﴿٤٦﴾ قَالُوٓا۟ ءَامَنَّا بِرَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٤٧﴾ رَبِّ مُوسَىٰ وَ
هَٰرُونَ ﴿٤٨﴾ قَالَ ءَامَنتُمْ لَهُۥ قَبْلَ أَنْ ءَاذَنَ لَكُمْ إِنَّهُۥ لَكَبِيرُكُمُ
ٱلَّذِى عَلَّمَكُمُ ٱلسِّحْرَ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُونَ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ
وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَٰفٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٤٩﴾ قَالُوا۟
لَا ضَيْرَ إِنَّآ إِلَىٰ رَبِّنَا مُنقَلِبُونَ ﴿٥٠﴾ إِنَّا نَطْمَعُ أَن يَغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا

خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۱﴾ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنْ
اَسْرِ بِعِبَادِيْٓ اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۵۲﴾ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَآئِنِ
حٰشِرِيْنَ ﴿۵۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاِنَّهُمْ لَنَا
لَغَآئِظُوْنَ ﴿۵۵﴾ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ
جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۷﴾ وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ﴿۵۸﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ
قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِىَ رَبِّىْ
سَيَهْدِيْنِ ﴿۶۲﴾ فَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ﴿۶۳﴾ وَاَزْلَفْنَا
ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۴﴾ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿۶۵﴾ ثُمَّ
اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۶۶﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۶۷﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۶۸﴾

ع ۱۸ / ۳ / ۷ — ع ۱۷ / ۴ / ۸

ترجمہ آیات ۱۰-۶۸

اور جب پکارا تیرے رب نے موسیٰ کو کہ ظالم قوم ——— قوم فرعون ——— کے پاس
جاؤ، کیا وہ ڈریں گے نہیں! اس نے کہا، اے میرے رب! مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا
دیں گے اور میرا سینہ بھنچتا ہے اور میری زبان رواں نہیں ہے تو ہارون کے پاس پیغام
بھیج اور ان کے ایک گناہ کا بار بھی میرے اوپر ہے تو میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر
دیں گے۔ ۱۰-۱۴

فرمایا، ہرگز نہیں! پس تم دونوں ہماری نشانیوں کے ساتھ جاؤ، ہم تمہارے ساتھ

سننے والے ہیں۔ تو فرعون کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم خداوند عالم کے رسول ہیں کہ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دے۔ اس نے کہا، کیا ہم نے تم کو بچپن میں اپنے اندر پالا نہیں؟ اور تم نے اپنی عمر کے کئی سال ہمارے اندر بسر کیے اور تم نے اپنی وہ حرکت کی جو کی اور تم ناشکروں میں سے ہو! ۱۵-۱۹

موسیٰ نے جواب دیا کہ میں نے یہ اس وقت کیا اور میں خطا واروں میں سے تھا تو جب مجھے تم لوگوں سے اندیشہ ہوا تو میں تم سے بھاگا۔ پھر میرے رب نے مجھے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے رسولوں میں سے بنایا۔ اور یہ احسان ہے جو تم مجھے جتا رہے ہو جس کے عوض تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! ۲۰-۲۲

فرعون نے پوچھا اور یہ رب العالمین کیا چیز ہے! اس نے جواب دیا کہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا خداوند، اگر تم لوگ یقین کرنے والے بنو! اس نے اپنے ارد گرد والوں سے کہا، سنتے نہیں ہو! اس نے کہا، تمہارا بھی رب اور تمہارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب! فرعون نے کہا، تمہارا یہ رسول، جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، بالکل خبطی ہے۔ موسیٰ نے کہا، مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب، اگر تم عقل رکھتے ہو! وہ بولا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تمہیں قید کر کے رہوں گا۔ موسیٰ نے کہا، کیا اس صورت میں بھی کہ جب میں تمہارے پاس کوئی واضح نشانی لے کر آیا ہوں؟ اس نے کہا، وہ پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ تو اس نے اپنا عصا ڈال دیا اور وہ دفعتہً ایک صریح اژدہا بن گیا اور اس نے اپنا ہاتھ کھینچا تو وہ یکایک دیکھنے والوں کو چٹا نظر آیا۔ فرعون نے اپنے ارد گرد کے درباریوں سے کہا، بے شک یہ بڑا

ہی ماہر جادوگر ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تمھیں تمھارے ملک سے نکال دے تو تم لوگ، کیا مشورہ دیتے ہو! ۲۳-۳۵

انھوں نے کہا کہ اس کو اور اس کے بھائی کو ابھی ٹالیے اور شہروں میں ہرکارے بھیجیے۔ جو آپ کے پاس تمام ماہر جادوگروں کو لائیں۔ تو ساحر ایک معین دن کے مقررہ وقت کے لیے جمع کیے گئے اور لوگوں کو منادی کر دی گئی کہ لوگو، جمع ہو تاکہ ہم ساحروں کا ساتھ دیں اگر وہ غالب رہنے والے ثابت ہوں تو جب ساحر جمع ہوئے تو انھوں نے فرعون سے کہا، کیا ہمارے لیے کوئی صلہ بھی ہے اگر ہم ہی غالب رہنے والے ہوئے! اس نے کہا، ہاں! اور اس وقت تم مقربین میں سے بھی ہوگے۔ ۳۶-۴۲

موسیٰ نے ان سے کہا پیش کرو جو کچھ تم پیش کرنے والے ہو۔ انھوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں اور بولے کہ فرعون کے اقبال کی قسم، ہم ہی غالب رہنے والے ہوں گے! تو موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو یکایک وہ نگلنے لگا اس سوانگ کو جو وہ رچاتے تھے۔ تو ساحر بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ بولے کہ ہم ایمان لائے خداوند عالم، موسیٰ اور ہارون کے رب پر۔ ۴۳-۴۸

اس نے کہا، تم نے اس کو مان لیا قبل اس کے کہ میں تم کو اجازت دوں۔ بے شک وہی تمھارا گرو ہے جس نے تمھیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تو تم عنقریب جان لوگے! میں تمھارے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹوں گا اور تم سب کو سولی دوں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کوئی ڈر نہیں، ہم اپنے رب ہی کی طرف لوٹیں گے۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہماری غلطیاں بخش دے گا کہ ہم پہلے ایمان لانے والے بنے۔ ۴۹-۵۱

اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی، ہمارے بندوں کو لے کر راتوں رات نکل جاؤ۔ بے شک تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔ پس فرعون نے شہروں میں ہرکارے بھیجے کہ یہ لوگ مٹھی بھر ہیں اور یہ ہمیں غصہ دلا رہے ہیں اور ہم ایک مستعد جمعیت ہیں۔ ۵۲-۵۶

پس ہم نے نکالا ان کو باغوں اور چشموں سے اور خزانوں اور ایک باعزت مقام سے۔ اسی طرح ہم کرتے ہیں اور ہم نے ان چیزوں کا وارث بنایا بنی اسرائیل کو۔ ۵۷-۵۹

پس انھوں نے ان کا تعاقب کیا صبح تڑکے۔ تو جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں تو موسیٰ کے ساتھیوں نے کہا، ہم تو پکڑے گئے! موسیٰ نے کہا، ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے وہ میری رہنمائی فرمائے گا۔ ۶۰-۶۲

پس ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اپنا عصا دریا پر مارو۔ پس وہ پھٹ گیا اور ہر حصہ ایک عظیم تودے کے مانند بن گیا۔ اور ہم قریب لائے وہیں دوسروں کو اور ہم نے موسیٰ اور جو اس کے ساتھ تھے سب کو نجات دی، پھر دوسروں کو غرق کر دیا۔ ۶۳-۶۶

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب، وہ عزیز و رحیم ہے۔ ۶۷-۶۸

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ نَادٰی رَبُّكَ مُوْسٰٓى اَنِ ائْتِ الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَوْمَ فِرْعَوْنَ ۭ اَلَا يَتَّقُوْنَ (۱۰-۱۱)

یہ حضرت موسیٰؑ کی سرگزشت کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب مدین سے واپس ہوتے ہوئے وادیٔ مقدس طویٰ میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلام سے مشرف فرمایا اور ان کو منصب رسالت پر سرفراز کر کے فرعون اور اس کی قوم کے پاس انذار کے لیے جانے کی ہدایت فرمائی۔

ایک خاص اسلوب بیان

'اَلَا يَتَّقُوْنَ' کا اسلوب بیان فرعون اور اس کی قوم کے غایت درجہ طغیان و فساد کو ظاہر کر رہا ہے۔

اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کیا یہ ظالم لوگ اسی طرح بگٹٹ اپنی سرکشی میں بڑھتے ہی چلے جائیں گے اور اس کے انجام اور خدا کے قہر و غضب سے نہیں ڈریں گے؟ آگے آیات ۱۲۵، ۱۴۳، ۱۶۲ اور ۱۷۸ سے معلوم ہوگا کہ بعینہ اسی اسلوب سے دوسرے انبیائے کرام نے بھی اپنی اپنی قوموں کو انذار فرمایا ہے۔ اس اسلوب خطاب میں حسرت، غصہ، زجر و ملامت اور عذاب الٰہی کے قرب کی جو وعید ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ ہ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ فَاَرْسِلْ اِلٰی هٰرُوْنَ ہ وَلَهُمْ عَلَیَّ ذَنْۢبٌ فَاَخَافُ اَنْ یَّقْتُلُوْنِ ہ (۱۲-۱۴)

نبوت پاکر حضرت موسیٰؑ کے اندیشے

حضرت موسیٰؑ اس عظیم ذمہ داری سے بہت ڈرے اور یہ ڈر ذمہ داری کے صحیح احساس کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ مدین جانے سے پہلے ہی انھیں یہ اندازہ اچھی طرح ہو چکا تھا کہ فرعونیوں کے سامنے کوئی حق بات کہنا کتنا مشکل ہے۔ نیز وہ اپنے اندر قوت بیان کی کمی بھی محسوس فرماتے تھے اور قبطی کی موت کا جو واقعہ ان کے ہاتھوں ہو چکا تھا اس کی بنا پر بھی وہ اندیشہ ناک تھے کہ فرعون اور اس کے اعیان ان کے خلاف غصہ میں بھرے بیٹھے ہوں گے وہ ان کو آسانی سے معاف کرنے والے نہیں ہیں، بالخصوص اس صورت میں جب کہ وہ ان کے سامنے رسالت کا دعویٰ لے کر جائیں گے اور ان کے ظلم و تعدی پر ان کو انذار کریں گے۔ اپنے یہ اندیشے ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ حضرت موسیٰؑ نے اپنی یہ گزارش بھی پیش کر دی کہ اگر مرضی الٰہی یہی ہے کہ میں یہ بارِ گراں اٹھاؤں تو میری مدد کے لیے براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے بھائی ہارون کو میرا شریکِ کار بنا دیا جائے جو فصیح اللسان آدمی ہیں۔ تاکہ ہم دونوں مل کر اس خدمت کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں۔

قَالَ کَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰیٰتِنَآ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ ہ فَاْتِیَا فِرْعَوْنَ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہ اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۵-۱۷)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطمینان دہانی

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کے اس اندیشے کی تو پوری شدت کے ساتھ تردید فرما دی کہ قبطی انھیں قتل کر دیں گے لیکن حضرت ہارونؑ کے بارے میں ان کی درخواست، جیسا کہ دوسرے مواقع میں تصریح اور یہاں اشارہ ہے، منظور فرمائی اور ان کو حکم دیا کہ تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ اور کوئی اندیشہ نہ رکھو۔ اِنَّا مَعَکُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ، اطمینان دہانی کا نہایت بلیغ فقرہ ہے۔ دوسرے مقام میں یہی بات یوں ارشاد ہوئی ہے، اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰی (طٰہٰ - ۴۶) (میں تم دونوں کے ساتھ سنتا اور دیکھتا ہوں تو مجال ہے کہ کوئی تمھیں گزند پہنچا سکے!)

فرعون کی طرف ایک کے بجائے دو رسول

اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارونؑ، حضرت موسیٰؑ کے مددگار، شریکِ رسالت کی حیثیت سے تھے۔ دوسرے مقام میں اس کی وضاحت ہو گئی۔ فرمایا ہے:

اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ (طٰہٰ: ٤٧) (ہم دونوں تیری طرف تیرے رب کے رسول ہیں) فرعون کے سامنے اس امر واقعی کا اظہار اتمام حجت کے پہلو سے ہوا ہے کہ ایک چھوڑ دو دو رسول، اللہ نے اس کی طرف بھیجے ہیں اگر اس کے بعد بھی اس نے صحیح روش اختیار نہ کی تو اس کی شامت ہی ہے۔

اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ سے متعلق مولانا فراہی کا نقطۂ نظر

اَنْ اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کی وضاحت سورۂ طٰہٰ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ ہم کر چکے ہیں۔ تورات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کو عید قربانی منانے کے لیے تین دن کی راہ بیابان میں لے جانا چاہتے تھے، لیکن یہ تصریح تورات میں نہیں ہے کہ بیابان میں کہاں لے جانا چاہتے تھے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ ان کو حج و قربانی کے لیے مکہ معظمہ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے مولانا کا یہ خیال ایک نظریے کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے، ان کے دلائل میرے سامنے نہیں ہیں اس وجہ سے میں پوری طرح اس پر مطمئن نہیں ہوں۔ میں اپنا رجحان اعراف کی تفسیر میں ظاہر کر چکا ہوں۔ بعض باتیں مولانا کے اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ ممکن ہے آگے کسی موزوں مقام پر میں ان کی وضاحت کروں۔ فرعون کو انذار کے ساتھ یہ حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل کی تنظیم اور ان کے اندر دین کے احیاء و تجدید کے سلسلہ میں پہلی ہدایت ہوئی۔

تورات میں اس واقعہ کے ابہام کی وجہ

اس امر خاص میں تورات کے بیان کے اندر جو ابہام ہے اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو حضرت موسیٰؑ نے اس کو فرعون پر ظاہر نہ کرنا چاہا ہو اس وجہ سے اس کو مبہم ہی رکھا ہو یا یہ ہوا کہ یہود نے اس کے اظہار کو اپنے مصالح کے خلاف پا کر جس طرح حضرت اسماعیلؑ اور خانہ کعبہ کی ساری تاریخ پر پردہ ڈال دیا اسی طرح اس بات پر بھی پردہ ڈال دیا۔

'اَنْ اَرْسِلْ' اصل میں 'بِاَنْ اَرْسِلْ' ہے۔ عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق ب حذف ہو گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس پیغام کے ساتھ رسول بن کر آئے ہیں۔

قَالَ اَلَمْ نُرَبِّكَ فِيْنَا وَلِيْدًا وَّلَبِثْتَ فِيْنَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِيْنَ ۝ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (١٨-١٩)

فرعون کا حضرت موسیٰؑ کو حقارت آمیز جواب

یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ حذف ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے بھائی حضرت ہارونؑ کو ساتھ لے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس گئے اور انذار کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے بنی اسرائیل کو اپنے ساتھ لے جانے کا مطالبہ بھی رکھا۔ بھلا فرعون یہ تصور کہاں کر سکتا تھا کہ کوئی اس کے سامنے اتنا بڑا دعویٰ اور اتنا اہم مطالبہ لے کر آئے گا اور وہ بھی ایک اسرائیلی! اس نے نہایت حقارت آمیز انداز میں کہا کہ کیا تم وہی نہیں ہو جس کی پرورش بچپن میں ہم نے اپنے گھر میں کی ہے اور کیا تم وہی نہیں ہو جس نے وہ حرکت کی جو تم نے کی! بے شک تم بڑے ہی ناشکرے ہو۔ 'کَافِر' یہاں لغوی یعنی ناشکرے کے معنی میں ہے اور 'وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ' سے اس کا اشارہ قبطی کے واقعۂ قتل

کی طرف تھا جس کی سنگینی کی تعبیر کے لیے اس نے یہ ابہام کا اسلوب اختیار کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ایا نہ قدرِ خود بشناس! تم ہمارے پروردہ اور ہمارے مجرم ہونے کے باوجود ہمارے سامنے اپنی نبوت کا دعویٰ اور بنی اسرائیل کو ساتھ لے جانے کا مطالبہ لے کر اٹھے ہو!

قَالَ فَعَلْتُهَآ إِذًا وَّأَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِيْ رَبِّيْ حُكْمًا وَّ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ (۲۰-۲۱)

ضَالّ کا مفہوم

'ضَآلٌّ' یہاں اسی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس مفہوم میں وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى (الضحیٰ: ۷) میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی سرگشتہ، جویائے راہ، کھویا ہوا۔

حضرت موسیٰ کا اعترافِ حق اور اظہارِ حق

حضرت موسیٰ نے جہاں تک قبطی کے واقعہ کا تعلق تھا صاف صاف اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور فرمایا کہ بے شک مجھ سے یہ فعل صادر تو ہوا لیکن اس وقت ہوا جب مجھے میرے رب کی طرف سے علم کی صحیح روشنی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ میں ابھی جستجوئے علم کی راہ میں سرگشتہ اور کھویا ہوا تھا، چنانچہ جب مجھ سے یہ فعل صادر ہو گیا اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اس نادانستہ فعل پر آپ لوگ مجھے قتل کر دیں گے تو میں یہاں سے نکل گیا۔ اس کے بعد میرے رب نے مجھے علم و حکمت کی روشنی اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور مجھے اپنے رسولوں میں سے بنایا اور اب میں ایک رسول کی حیثیت سے آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں۔ میری موجودہ حیثیت میری سابق حالت سے بالکل مختلف ہے۔ اس گزرے ہوئے واقعہ کو نظر انداز کر کے میری بات پر دھیان کیجیے۔

قبطی کے قتل کے واقعہ کی نوعیت پر ہم سورۂ طٰہٰ میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں کہ یہ محض حمایتِ مظلوم کے جذبہ کے تحت حضرت موسیٰ سے بالکل بلا قصد صادر ہو گیا جس پر حضرت موسیٰ کو نہایت صدمہ ہوا۔ انھوں نے توبہ کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

تنہا عقل رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہے

اس امر پر بھی ہم سورۂ ہود کے تحت گفتگو کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام بعثت سے قبل بھی فطرتِ سلیم پر ہوتے تھے لیکن تنہا فطرت اور عقل زندگی کے پُر پیچ راستوں میں انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہیں۔ اس میں بہت سے موڑ ایسے آتے ہیں جہاں انسان کی عقل سرگشتہ و حیران رہ جاتی ہے اور جب تک اس کو خدا کی رہنمائی حاصل نہ ہو وہ صحیح فیصلہ نہیں کر سکتی۔ اسی حکمت و معرفت کو حضرت موسیٰ نے یہاں 'حُکم' سے تعبیر فرمایا ہے۔ آگے آیت ۸۳ کے تحت اس کی مزید وضاحت آئے گی۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ (۲۲)

حضرت موسیٰ کا بلیغ جواب

یہ حضرت موسیٰ نے فرعون کے اس اظہارِ احسان کا جواب دیا ہے جس کا ذکر آیات ۱۸-۱۹ میں گزرا ہے اور غور کیجیے کہ کس قدر بلیغ جواب دیا ہے۔ فرمایا کہ تم اپنا یہ احسان مجھے اپنے اس ظلم عظیم کو جائز ثابت کرنے کے لیے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! مطلب یہ ہے کہ یہ احسان ہے تو یہی، اس کا

شکریہ! لیکن اس احسان کے بدلے میں تمھیں یہ حق تو نہیں حاصل ہو سکتا کہ تم تمام بنی اسرائیل کو غلام بنائے رکھو اور میں اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھاؤں!

قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (٢٣)

دعوائے رسالت کا استہزاء

فرعون اپنے طعنہ اور اظہارِ احسان کا جواب، تو ایسا مسکت، پا گیا کہ اس کے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی اس وجہ سے اس نے اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے حضرت موسیٰؑ کے دعوائے رسالت، کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اوپر آیت ۱۶ میں گزر چکا ہے کہ حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام نے اس کے سامنے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ اس نے 'رب العالمین' کا مذاق اڑایا کہ یہ رب العلمین کیا چیز ہے جس کے تم دونوں رسول بن کر آئے ہو؟ اس کا مطلب یہ تھا کہ سب سے بڑے دیوتا کا اوتار اور رب العلمین تو میں ہوں، تو میرے ہوتے اور کون رب العلمین ہے جس نے تم کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟

قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ (٢٤)

دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے اس کے اس گستاخانہ طنز کے جواب میں اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ فرمایا کہ تمھارا رب العلمین وہی ہے جو آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سب کا رب ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'مَا بَيْنَهُمَا' کے تحت، سورج چاند، سب آ گئے اور فرعون، جیسا کہ دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، سورج دیوتا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔

'اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ' یعنی اصل حقیقت یہ ہے جو میں نے واضح کر دی ہے۔ اس کو مانو یا نہ مانو، اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں۔ بلکہ خود تم لوگوں پر ہے۔

قَالَ لِمَنْ حَوْلَهٗٓ اَلَا تَسْتَمِعُوْنَ (٢٥)

فرعون کی بوکھلاہٹ

حضرت موسیٰؑ کا جواب فرعون کے کبر پر ایک کاری ضرب تھا اس وجہ سے وہ تلملا اٹھا اور درباریوں کی طرف متوجہ ہو کر بولا کہ تم لوگ سن رہے ہو، یہ شخص کیا کہہ رہا ہے!

قَالَ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ (٢٦)

دعوت کی راہ میں مزید ایک قدم اور آگے کی طرف

حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے اس غیظ و غضب کی کوئی پروا کیے بغیر اپنی دعوت کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا، فرمایا کہ تمھارا بھی رب اور تمھارے اگلے آباء و اجداد کا بھی رب! یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باطل ادیان کی بنیاد تمام تر پچھلوں کی تقلید ہی پر ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے لگے ہاتھوں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی کہ اگر اس معاملے میں تم نے اپنے باپ، دادا کی روایات پر بھروسہ کیا ہے تو یہ بھروسہ بے بنیاد ہے۔ ان کا رب بھی وہی ہے جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ اگر انھوں نے اس کو چھوڑ کر کسی اور کو رب بنایا تو یہ ان کی ضلالت و جہالت ہے۔ ان کی کورانہ تقلید کر کے اپنی عاقبت برباد نہ کرو۔

قَالَ اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِيْٓ اُرْسِلَ اِلَيْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ (٢٧)

فرعون کی جھنجھلاہٹ

حضرت موسیٰ نے جب ان کے آباو اجداد کی گمراہی بھی واضح کردی تو فرعون کا پارہ بہت چڑھ گیا، غصہ سے جھنجھلا کر اس نے نہایت تحقیر انگیز، طنزیہ انداز میں، درباریوں سے کہا کہ تمھارا یہ رسول، جو بزعم خویش تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے، مجھے تو ایک بالکل دیوانہ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جب یہ شخص ہمارے آباو اجداد کو بھی احمق اور گمراہ ثابت کر رہا ہے تو اس کے پاگل ہونے میں کیا شبہ رہا! رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْٓ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ میں طنز کے ساتھ لوگوں کو اکسانے کی خواہش بھی مضمر ہے کہ دیکھو لو، یہ شخص ہے جو مدعی ہے کہ تمھاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے!

قَالَ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَمَا بَیْنَهُمَا ؕ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ (۲۸)

فرعون کی خدائی پر آخری ضرب

حضرت موسیٰ نے فرعون کی اس بدتمیزی کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا بلکہ اس کو بالکل نظر انداز کر کے اپنی دعوت کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ فرمایا کہ وہی مشرق و مغرب اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا رب ہے بشرطیکہ تم لوگ عقل سے کام لو اور سوچنے سمجھنے والے بنو! یہ فرعون کی خدائی پر حضرت موسیٰ کی آخری ضرب تھی۔ وہ اپنے آپ کو سورج کا اوتار سمجھتا تھا۔ حضرت موسیٰ نے اس پر واضح کر دیا کہ جس کو نہ مشرق پر کوئی اختیار نہ مغرب پر، اگر وہ اپنے آپ کو 'رب' سمجھتا ہے تو یہ اس کی اور اس کو رب ماننے والوں کی عقل کا فتور ہے۔ آپ لوگ اپنی عقل سے کام لیں تو یہ بات ایسی واضح ہے کہ کسی کو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش آنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ (۲۹)

فرعون کی دھمکی

جب فرعون نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ اس کی کسی بات کو سرے سے لائق اعتنا ہی نہیں سمجھتے بلکہ پوری بے خوفی کے ساتھ اپنی ایک بات کے بعد دوسری بات پہلی سے بھی بڑھ چڑھ کر کہہ گزرتے ہیں اور ہر بات اس کی خدائی پر ایک سخت سے سخت تر ضرب کی نوعیت رکھتی ہے تو وہ بالکل بے حوصلہ ہو کر چلا اٹھا کہ اگر تم نے میرے سوا کسی اور کو معبود مانا تو یاد رکھو کہ میں تمھیں قید کر کے چھوڑوں گا۔

قَالَ اَوَلَوْ جِئْتُكَ بِشَیْءٍ مُّبِیْنٍ (۳۰)

معجزات کی نشانی

اس کا گمان ہوگا کہ اس کھلی ہوئی دھمکی کے بعد حضرت موسیٰ سہم جائیں گے لیکن انھوں نے نہایت متانت اور وقار کے ساتھ فرمایا کہ کیا تمھارا یہی فیصلہ اس صورت میں بھی ہوگا جب میں تمھیں کوئی نہایت واضح نشانی اس بات کی دکھا دوں کہ میں خدا کا بھیجا ہوا رسول ہوں؟

قَالَ فَاْتِ بِهٖۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ (۳۱)

حضرت موسیٰ کا عصا اور ید بیضا کا معجزہ دکھانا

فرعون نے کہا اگر تم اپنی سچائی کی کوئی نشانی رکھتے ہو تو اس کو دکھاؤ۔

فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِیَ ثُعْبَانٌ مُّبِیْنٌ ۚۖ وَّنَزَعَ یَدَهٗ فَاِذَا هِیَ بَیْضَآءُ لِلنّٰظِرِیْنَ (۳۲-۳۳)

فرعون کے اس مطالبے پر حضرت موسیٰ نے عصا اور ید بیضا کے دونوں معجزے دکھائے۔ ان معجزات کی وضاحت

تفسیر سورۂ طٰہٰ میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف یہ چیز خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ یہ معجزے حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی طلب پر اس وقت دکھائے ہیں جب اس نے ان کی دعوتِ توحید کے جواب میں، جو تمام تر عقل و فطرت اور آفاق و انفس کے دلائل پر مبنی تھی، ان کو قید کرنے کی دھمکی دی ہے۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ (۳۴-۳۵)

معجزات کی قاہری اور فرعون کی ہوشیاری

ان معجزات کی قاہری ایسی نمایاں تھی کہ فرعون اور اس کے درباری سب ہک دک رہ گئے۔ لیکن فرعون نے نہایت ہوشیاری سے لوگوں کو مرعوبیت سے بچانے کی کوشش کی۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کے اس کارنامے کی تو داد دی اس لیے کہ اس سے مفر نہیں تھا لیکن ساتھ ہی یہ تاثر بھی لوگوں کو دینے کی کوشش کی کہ یہ محض فنِ جادوگری میں مہارت کا کرشمہ ہے، اس کو نبوت و رسالت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید برآں حضرت موسیٰؑ کے خلاف ایک سیاسی بدگمانی پیدا کرنے کے لیے ذہنوں میں یہ وسوسہ بھی ڈال دیا کہ یہ شخص اپنے جادو کے زور سے لوگوں کو اپنے حق میں ہموار کرنا اور ہم کو اس ملک سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ ہم دوسرے مقام میں نہایت وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت اس بدگمانی کے پھیلنے کے لیے فضا نہایت سازگار تھی۔ اس پہلو سے ڈرا کر فرعون نے درباریوں سے پوچھا کہ اس خطرے کی مدافعت کے لیے آپ لوگ کیا مشورہ دیتے ہیں!

قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ۙ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سَحَّارٍ عَلِيْمٍ (۳۶-۳۷)

درباریوں کا مشورہ

درباریوں نے مشورہ دیا کہ بہتر ہے کہ ان کے جادو کا توڑ جادو ہی سے کیا جائے لیکن عام جادوگروں سے ان کا مقابلہ کرانا قرینِ مصلحت نہیں ہے۔ اس میں شکست اور جگ ہنسائی کا اندیشہ ہے۔ اس وجہ سے بروقت تو ان کو ٹال دیجیے اور مملکت کے تمام شہروں میں اپنے خاص آدمیوں کو بھیج کر تمام ماہر جادوگروں کو بلوائیے اور ان سے ان کا مقابلہ کرائیے۔

فَجُمِعَ السَّحَرَةُ لِمِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۙ وَّقِيْلَ لِلنَّاسِ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ ۙ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ (۳۸-۴۰)

حضرت موسیٰؑ سے مقابلہ کی تیاری

درباریوں کے اسی مشورے پر عمل کیا گیا۔ ایک خاص دن میں، ایک معین وقت پر، ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو مرکز میں جمع کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ دوسرے مقام میں یہ تصریح بھی ہے کہ ایک دن میلہ کا اور وقت چاشت کا مقرر ہوا اور مقابلہ کے لیے میدان ایک ایسا منتخب ہوا جس میں ہر سمت کے لوگوں کو پہنچنے میں یکساں سہولت ہو۔ مزید برآں وقتِ موعود پر لوگوں کو جمع ہونے کے لیے خوب ابھارا بھی گیا کہ ہمارے ساحر اس وقت ملک کو ایک بہت بڑے خطرے سے بچانے کے لیے جمع ہو رہے ہیں۔ اس وجہ سے ہر شخص کا فرض ہے کہ ان کی حوصلہ افزائی اور ان کا ساتھ دینے کے

لیے اس موقع پر ضرور موجود ہو۔ هَلْ اَنْتُمْ مُّجْتَمِعُوْنَ کے استفہامیہ اسلوب میں حث و تحریض اور تشویق و ترغیب کا جو مفہوم مضمر ہے وہ عربی کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔ اس کی بعض مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں اور آگے بھی اس کی نہایت بلیغ مثالیں آئیں گی۔ لَعَلَّنَا نَتَّبِعُ السَّحَرَةَ اِنْ كَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ہمارے یہ ساحر اس وقت ہمارے قومی وقار کے تحفظ کے لیے میدان میں اترے ہیں تو ہم میں سے ہر شخص کو اس بات کا آرزومند ہونا چاہیے کہ ان کو اس مقابلے میں فتح حاصل ہو اور ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمیں ان کا ساتھ دینا چاہیے۔

فَلَمَّا جَآءَ السَّحَرَةُ قَالُوْا لِفِرْعَوْنَ اَئِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ ۝ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ اِذًا لَّمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۱-۴۲)

فرعون کی طرف سے ساحروں کی حوصلہ افزائی

ساحر جب فرعون کے سامنے حاضر ہوئے تو انھوں نے عام پیشہ وروں کی طرح یہ التجا پیش کی کہ اگر ہم اس مقابلے میں غالب رہے تو سرکار سے بھرپور انعام ملے گا نا! فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ انعام تو جو ملنا ہے وہ ملے ہی گا۔ مزید برآں تم پر اس جانب کی یہ نوازش بھی ہوگی کہ تم مقربین بارگاہِ شاہی میں شامل کیے جاؤ گے!

قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰٓى اَلْقُوْا مَآ اَنْتُمْ مُّلْقُوْنَ ۝ فَاَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوْا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ اِنَّا لَنَحْنُ الْغٰلِبُوْنَ (۴۳-۴۴)

حضرت موسیٰ اور ساحر میدانِ مقابلہ میں

جب میدانِ مقابلہ میں حضرت موسیٰ اور ساحروں کا آمنا سامنا ہوا تو حضرت موسیٰ نے ساحروں ہی کو پہل کرنے کا موقع دیا۔ فرمایا کہ جو ہنر تم دکھانا چاہتے ہو دکھاؤ۔ ان کے پاس جو رسیاں اور لاٹھیاں تھیں وہ انھوں نے پانسہ کے تیروں کی طرح پھینکیں اور ساتھ ہی یہ قسم کھائی کہ فرعون کے اقبال کی قسم ہم ہی غالب رہیں گے! بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ میں 'ب' ہمارے نزدیک قسمیہ ہے۔ فرعون کو چونکہ ان کے ہاں دیوتا کی حیثیت حاصل تھی اس وجہ سے کوئی اہم قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے عزت و اقبال کی قسم کھاتے۔ تورات میں ان کے شواہد موجود ہیں۔

فَاَلْقٰى مُوْسٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَاْفِكُوْنَ (۴۵)

سحر و ساحری کے طلسم پر عصائے موسیٰ کی ضربِ کاری

جواب میں حضرت موسیٰ نے اپنا عصا پھینکا اور وہ ان کے اس سارے سوانگ کو، جو وہ اب تک لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے رچاتے رہے تھے، نگلنے لگا۔ مَا يَاْفِكُوْنَ کے اسلوب سے یہ بات نکلتی ہے کہ صرف یہی نہیں ہوا کہ اس موقع پر ساحروں نے جو کرتب دکھایا عصائے موسیٰ نے اس کا بھرم کھول دیا، بلکہ اس نے ان کے اب تک کے سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا اس لیے کہ یہی ہنر کا شاہکار تھا جب اس کا یہ حشر ہوا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ عصائے موسیٰ نے سحر و ساحری کے سارے طلسم ہی کو باطل کر دیا۔

فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِينَ ، قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ، رَبِّ مُوسٰى وَهٰرُونَ (۴۶-۴۸)

ساحروں کا اعترافِ حق

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ سحر و معجزہ کے فرق کو سب سے زیادہ پرکھنے والا ایک ساحر ہی ہو سکتا ہے اگر اس کے اندر اعترافِ حق کی رمق ہو۔ ان ساحروں کے اندر یہ رمق موجود تھی اس وجہ سے وہ اس کو دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے بعلیٰ رُؤس الاشہاد اپنے ایمان کا اعلان کر دیا اور اس تصریح کے ساتھ کہ ہم ایمان لائے ربّ العالمین، موسیٰ اور ہارون کے رب پر! اوپر آیات ۱۶ اور ۲۴ میں فرعون کے اس غیظ و غضب کا ذکر گزر چکا ہے جو حضرت موسیٰؑ کے پیش کردہ 'ربّ العالمین' کے خلاف وہ ظاہر کر چکا تھا۔ ساحروں نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر اسی ربّ العالمین پر اپنے ایمان کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ اتنی وضاحت اور بھی کر دی کہ موسیٰ اور ہارون کے رب پر، تاکہ کسی ادنیٰ اشتباہ کی بھی کوئی گنجائش کسی کے لیے باقی نہ رہے۔ یہ ہے ایمان کا ایک ادنیٰ کرشمہ!

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ، لَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُصَلِّبَنَّكُمْ اَجْمَعِيْنَ (۴۹)

فرعون کی طرف سے سازش کا ہوّا

بھرے میدان میں اس طرح کی شکست سے ظاہر ہے کہ فرعون اور اس کے درباریوں کی نہایت سخت رسوائی ہوئی لیکن فرعون آسانی سے شکست ماننے والا آدمی نہیں تھا اس نے حالات کو سنبھالنے کے لیے فوراً ایک سازش کا ہوّا کھڑا کر دیا۔ ساحروں سے کہا، تم نے میری اجازت کے بغیر اس طرح سب کے سامنے اس شخص پر اپنے ایمان کا جو اعلان کیا ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہی تمہارا گرو ہے جس نے تمہیں جادو کی تعلیم دی ہے۔ تمہاری اور اس کی پہلے سے ملی بھگت تھی کہ اس طرح تم سب کے سامنے اپنی شکست مان لو گے جس سے اس کی دھاک سب کے دلوں پر بیٹھ جائے گی اور ملک کے اندر انقلاب برپا کرنے کی راہ اس شخص کے لیے ہموار ہو جائے گی۔ یہ مملکت کے خلاف تم نے ایک سازش کی ہے اس وجہ سے میں تم کو اور تمہارے اس گروہ کو وہ سزا دوں گا جو حکومت کے باغیوں کو دی جاتی ہے پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں گے اور پھر عبرتِ عام کے لیے تم کو سولی پر لٹکایا جائے گا۔

خاص قابلِ توجہ بات

یہاں اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ کے الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ فرعون کا مطلب یہ تھا کہ اگر فی الواقع تم نے اس شخص کو راست باز آدمی سمجھا تھا تو تمہاری خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ تم یہ بات پہلے میرے علم میں لاتے اور میں اس کی روشنی میں کوئی فیصلہ کرتا لیکن تم نے میری اجازت کے بغیر سب کچھ بطورِ خود کر ڈالا جو اس بات کا صاف ثبوت ہے کہ یہ فتح و شکست کا سارا ڈراما تمہاری ایک سازش ہے۔

قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ، اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ

اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۵۰-۵۱)

'لَاضَیْرَ'۔ 'ضَیْرَ' کے معنی حرج اور ضرر کے ہیں۔ اور 'اَنْ کُنَّا' اصل میں 'لِاَنْ کُنَّا' ہے۔ زبان کے معروف قاعدے کے مطابق 'ل' یہاں حذف ہوگیا ہے۔

نورِ ایمان کا کرشمہ

فرعون نے دھمکی تو بہت بڑی دے دی لیکن اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اب یہ ساحر وہ ساحر نہیں ہیں جنھوں نے بڑی لجاجت سے اس سے انعام کی درخواست کی تھی بلکہ نورِ ایمان کی ایک ہی جھلک نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں پہنچ کر فرعون اور اس کی ساری سلطنت کی ان کی نگاہوں میں بالِ مگس کے برابر بھی وقعت باقی نہیں رہی ہے۔ انھوں نے بڑی بے خوفی کے ساتھ جواب دیا کہ اگر ہم کو یہ سزا ملی جس کی دھمکی دی گئی ہے تو اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہے، ہم بہرحال اپنے رب ہی کے پاس جائیں گے اور اگر ہم تیرے نزدیک اس بنا پر سازش کی سزا کے مستحق ہیں کہ تیری اجازت کے بدون ہم نے موسیٰؑ پر ایمان لانے میں سبقت کی ہے تو ہم اس سزا کا خیر مقدم کرتے ہیں اس لیے کہ 'اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ' ہونے کے صلے میں ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہماری تمام غلطیاں معاف فرما دے گا۔

اگرچہ ہما شما کے لیے یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ساحر ایک ہی جست میں معرفت کے اس مرتبۂ بلند پر پہنچ گئے لیکن یہ بات تعجب کی نہیں ہے۔ سیدنا مسیحؑ نے بھی اپنے ان پڑھ شاگردوں سے فرمایا تھا کہ جب میرے نام پر تم کو لوگ عدالتوں میں پکڑوائیں گے تو پہلے سے نہ سوچنا کہ کیا جواب دوگے۔ وقت پر روح القدس خود تمھارے دل میں بات ڈالے گا۔

وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ (۵۲)

حضرت موسیٰؑ کی ہجرت اور فرعون کی طرف سے ان کا تعاقب

یہاں سرگزشت کا کچھ حصہ محذوف ہے۔ ہم دوسرے محل میں، قرآن اور تورات دونوں کی روشنی میں، یہ واضح کر چکے ہیں کہ اس مقابلے میں شکست کھا جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان ایک عرصے تک کشمکش چلتی رہی۔ اس دوران میں مصر پر بہت سی آفتیں نازل ہوئیں جن سے ملک تباہی کے کنارے آ لگا۔ ان مصائب سے تنگ آ کر فرعون کے درباریوں نے اس کو مشورہ دیا کہ بنی اسرائیل جہاں جانا چاہتے ہیں ان کو وہاں جانے کی اجازت دے دی جائے ورنہ ملک تباہ ہو جائے گا۔ بالآخر فرعون نے مجبور ہو کر اجازت تو دے دی لیکن جب حضرت موسیٰؑ اپنی پوری قوم کو ساتھ لے کر نکلے تو اس کی رائے بدل گئی، اس نے فوراً ہر جگہ اپنے آدمی بھیج دیے کہ تمام علاقوں کے سردار اپنے تمام فوجیوں اور تمام سامانِ جنگ کے ساتھ مرکز میں پہنچیں تاکہ بنی اسرائیل کا تعاقب کیا جائے۔

آیت میں اسی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے کہ ہم نے موسیٰؑ کو بذریعہ وحی یہ ہدایت کر دی کہ تم راتوں رات بنی اسرائیل کو لے کر نکل جاؤ اور ساتھ ہی اس بات سے بھی آگاہ کر دیا کہ اگرچہ فرعون نے تم کو جانے کی اجازت دے دی ہے لیکن اس کے باوجود تمھارا تعاقب کیا جائے گا۔ اس خطرے سے

تمھیں ہوشیار رہنا چاہیے۔

فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ o اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِیْلُوْنَ o وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ o وَاِنَّا لَجَمِیْعٌ حٰذِرُوْنَ (۵۳-۵۶)

فرعون خود اپنی تدبیر کے جال میں

چنانچہ فرعون نے سرداروں اور فوجیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے مملکت کے تمام شہروں میں اپنے آدمی دوڑا دیے اور چونکہ قبطی حضرت موسیٰؑ کے کارناموں سے بہت مرعوب تھے اس وجہ سے ان کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا بھی زور و شور سے کیا گیا کہ اسرائیلیوں کی حیثیت ہی کیا! وہ مٹھی بھر تو ہیں لیکن ہاتھی سے گنا کھانے چلے ہیں! وہ اپنی حرکتوں سے ہمیں غصّہ دلا رہے ہیں، لیکن ہم ایک بھاری جمعیت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے نمٹنے کے لیے پوری طرح چوکس اور بیدار ہیں! ہم ہرگز ان کو اس بات کا موقع نہیں دیں گے کہ وہ ملک میں کوئی گڑبڑ پیدا کریں یا ہمارے قابو سے باہر نکل جائیں!!

فَاَخْرَجْنٰهُمْ مِّنْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ o وَّكُنُوْزٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ (۵۷-۵۸)

یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تدبیر سے ان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے باغوں اور چشموں اور اپنے خزانوں اور دولت کدوں سے نکلیں اور اپنے تمام لاؤ لشکر اور سر و سامان سمیت سمندر میں غرق ہوں۔

كَذٰلِكَ ؕ وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۵۹)

ایک بلیغ حذف

'كَذٰلِكَ' کے بعد 'نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِیْنَ' یا اس کے ہم معنی الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی ہم مجرموں اور رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے ساتھ ایسا ہی کیا کرتے ہیں۔ اس حذف سے کلام میں جو زور پیدا ہو گیا ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

ضمیروں کے استعمال کا ایک مخصوص اسلوب

'وَاَوْرَثْنٰهَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' میں ضمیرِ مفعول سے مراد بعینہٖ وہی نعمتیں نہیں ہیں جن سے قبطیوں کو اللہ تعالیٰ نے نکالا بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے نکلنے کے بعد سرزمین فلسطین میں حاصل ہوئیں۔ چنانچہ دوسرے مقام میں اس کی تصریح بھی ہے۔ فرمایا:..... وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِیْنَ كَانُوْا یُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِیْ بٰرَكْنَا فِیْهَا ...... (الاعراف ۷-۱۳۷) (اور وہ لوگ جو دبا کے رکھے گئے تھے ہم نے ان کو اس سرزمین کے تمام مشرق و مغرب کا مالک بنایا جس میں ہم نے اپنی برکتیں رکھی تھیں) اس آیت میں 'ارضِ مبارک' سے مراد ظاہر ہے کہ سرزمین فلسطین ہے۔ مصر سے نکلنے اور صحرا گردی کا دور ختم ہونے کے بعد یہی زرخیز علاقہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا ہے۔ مصر یا مملکتِ مصر کے کسی علاقے پر بنی اسرائیل کا قبضہ تاریخوں سے ثابت نہیں ہے۔

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ ہم نے ضمیر کا مرجع معین کرنے میں یہاں تکلف سے کام لیا ہے۔ آیت کا ظاہر مفہوم تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن باغوں، چشموں اور خزانوں سے اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کو بے دخل کیا انہی کا وارث بنی اسرائیل کو بنایا۔ لیکن یہ شبہ صحیح نہیں ہے۔ اعلیٰ عربی میں ضمیریں اس طرح بھی آتی ہیں۔ اس کتاب میں ہم اس کی متعدد مثالیں ذکر کر چکے ہیں۔ سورۂ مائدہ میں اس کی ایک نہایت واضح مثال موجود ہے۔ مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے سوالات کی نوعیت کے سوالات کرنے سے ان الفاظ میں روکا گیا ہے۔

قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ (المائدہ - ۱۰۲)

اسی طرح کے سوالات تم سے پہلے ایک قوم کے لوگوں نے کیے تو وہ ان کو نباہ نہ سکنے کے سبب سے کافر ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ یہاں ضمیر کا مرجع جن سوالات کی طرف ہے بعینہٖ وہی سوالات بنی اسرائیل نے نہیں کیے تھے بلکہ اسی قبیل کے سوالات کیے تھے۔ اسی طرح آیت زیرِ بحث میں بھی بعینہٖ وہی باغ، چشمے اور خزانے مراد نہیں ہیں جن کا سابق آیت میں ذکر ہے بلکہ اسی نوع کی وہ نعمتیں اور برکتیں مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو مصر سے ہجرت کے بعد علاقۂ فلسطین میں حاصل ہوئیں۔

فَاَتْبَعُوْهُمْ مُّشْرِقِيْنَ ۝ فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰۤى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۶۰ - ۶۲)

حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کا تعاقب

بالآخر صبح تڑکے فرعونیوں نے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا۔ جب بنی اسرائیل نے دیکھا کہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کا لشکر تو وہ بہت گھبرائے کہ اب تو ہم مارے گئے۔ تورات میں ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰؑ کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ کیا مصر میں ہمارے دفن ہونے کے لیے جگہ نہیں تھی کہ تم نے یہاں لا کر ہمیں مروانے کا سامان کیا! حضرت موسیٰؑ نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبراؤ نہیں، میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ ہمارے لیے راہ کھولے گا۔ اگرچہ آگے سمندر ہے اور پیچھے فرعون کی فوجیں، بظاہر تمھیں راہ مسدود نظر آ رہی ہے لیکن میرے رب نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔ تمھیں ہرگز کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ خدا اپنی قدرت کا کرشمہ دکھائے گا اور ہمارے لیے راہ کھول کر رہے گی۔ تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے!

"جب مصر کے بادشاہ کو خبر ملی کہ وہ لوگ چل دیے تو فرعون اور اس کے خادموں کا دل ان لوگوں کی طرف سے پھر گیا اور وہ کہنے لگے کہ ہم نے یہ کیا کیا کہ اسرائیلیوں کو اپنی خدمت سے چھٹی دے کر ان کو جانے دیا ...... اور مصری فوج نے فرعون کے سب گھوڑوں اور رتھوں اور سواروں سمیت ان کا پیچھا کیا ...... اور جب فرعون نزدیک آ گیا تب بنی اسرائیل نے آنکھ اٹھا کر دیکھا کہ مصری

ان کا پیچھا کیے چلے آتے ہیں اور وہ نہایت خوف زدہ ہو گئے۔ تب بنی اسرائیل نے خداوند سے فریاد کی۔ اور موسیٰ سے کہنے لگے کیا مصر میں قبریں نہ تھیں کہ تو ہم کو وہاں سے مرنے کے لیے بیابان میں لے آیا ہے؟ .... تب موسیٰ نے لوگوں سے کہا ڈرو مت، چپ چاپ کھڑے ہو کر خداوند کی نجات کے کام کو دیکھو جو وہ آج تمہارے لیے کرے گا کیونکہ جن مصریوں کو تم آج دیکھتے ہو ان کو پھر کبھی ابد تک نہ دیکھو گے۔ خداوند تمہاری طرف سے جنگ کرے گا اور تم خاموش رہو گے"

(خروج: باب ۱۴: ۵-۱۴)

فَاَوۡحَيۡنَاۤ اِلٰى مُوۡسٰٓى اَنِ اضۡرِبْ بِّعَصَاكَ الۡبَحۡرَ‌ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرۡقٍ كَالطَّوۡدِ الۡعَظِيۡمِ‌ۚ‏ وَاَزۡلَفۡنَا ثَمَّ الۡاٰخَرِيۡنَ‌ۚ‏ وَاَنۡجَيۡنَا مُوۡسٰى وَمَنۡ مَّعَهٗۤ اَجۡمَعِيۡنَ‌ۚ‏ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا الۡاٰخَرِيۡنَ ؕ‏ (۶۳-۶۶)

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ

یہ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کے اعتماد علی اللہ کا امتحان تھا۔ اس امتحان میں بنی اسرائیل تو اپنی روایت کے مطابق بالکل ناکام رہے لیکن حضرت موسیٰؑ سو فیصد کامیاب ہوئے۔ اس امتحان سے گزرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا کہ اپنا عصا سمندر پر مارو۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کی۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ایسی ہوا چلی کہ سمندر کا پانی پھٹ کر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ دونوں طرف پانی کی دیوار کھڑی ہو گئی اور بیچ میں سے خشک راستہ نکل آیا۔ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر اس راستہ پر چلے۔ تدبیر الٰہی فرعونیوں کو بھی اسی مقام پر لائی اور انھوں نے بنی اسرائیل کے تعاقب میں اپنے رتھ اور گھوڑے سب ان کے پیچھے ڈال دیے۔ اس کے بعد حکم الٰہی سے وہ ہوا جس نے سمندر کے پانی کو پھاڑ کر راستہ پیدا کیا تھا رک گئی۔ حضرت موسیٰؑ تو اپنی قوم کے ساتھ بخیریت کنارے پر پہنچ گئے، ادھر سمندر کا پانی برابر ہونے لگا اور فرعونی اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ انھوں نے پیچھے بھاگنے کی کوشش کی لیکن بھاگنے کا وقت گزر چکا تھا۔ بالآخر پوری فوج غرق ہو گئی۔

تورات میں یہ ماجرا یوں بیان ہوا ہے:۔

"پھر موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور خداوند نے رات بھر تند پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنا دیا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر کے بیچ میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے اور ان کے دہنے اور بائیں ہاتھ پانی دیوار کی طرح تھا اور مصریوں نے تعاقب کیا اور فرعون کے سب گھوڑے اور رتھ اور سوار ان کے پیچھے پیچھے سمندر کے بیچ میں چلے گئے۔ ....

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھا تاکہ پانی مصریوں اور ان کے رتھوں اور سواروں پر پھر بہنے لگے۔ اور موسیٰ نے اپنا ہاتھ سمندر کے اوپر بڑھایا اور صبح ہوتے ہوتے سمندر پھر اپنی اصلی قوت پر آ گیا اور مصری الٹے بھاگنے لگے اور خداوند نے سمندر کے بیچ ہی

ئیں مصریوں کو تہہ و بالا کر دیا : خروج : باب ۱۴ : ۲۱-۲۷)

آیت میں لفظ طَوْدٌ جو آیا ہے اس کے معنی پہاڑ اور تودے کے ہیں۔ تورات میں اسی مفہوم کو دیوار سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مقامِ عبور سے متعلق استاذ امام مولانا فراہیؒ کی رائے علمائے اہلِ کتاب کی رائے سے بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے اپنی یہ رائے اپنی تفسیر سورۂ ذاریات میں ظاہر فرمائی ہے اس رائے کے حق میں ان کے دلائل چونکہ میرے علم میں نہیں ہیں اس وجہ سے میں اس باب میں ابھی متردد ہوں۔ سورۂ ذاریات، مجموعہ تفاسیر فراہی میں شامل ہے۔ تحقیق کے طالب اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۶۷-۶۸)

ترجیع

یہ سرگزشت کے آخر میں وہی ترجیع ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو نشانی ہی مطلوب ہے تو اس سرگزشت کے اندر بڑا سامانِ عبرت موجود ہے لیکن جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے وہ نشانیوں ہی کے مطالبے کرتے رہ جاتے ہیں۔ بڑی سے بڑی نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی فرعونیوں کی طرح ان کی اکثریت کو ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے سرکشوں کو جب چاہے پکڑ سکتا ہے، وہ 'عزیز' ہے لیکن وہ ان کو توبہ و اصلاح کے لیے مہلت دیتا ہے اس لیے کہ وہ 'رحیم' بھی ہے۔

۴- آگے کا مضمون —— آیات ۶۹-۱۰۴

حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اور ان کی قوم کے ردِ عمل کا بیان

آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت اور ان کی قوم کے ردِ عمل کا ذکر ہے اور آخر میں وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس سرگزشت کے سنانے سے بھی مقصود وہی ہے جو پچھلی سرگزشت کے سنانے سے ہے۔

ایک بات یہاں خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ پچھلی سورہ میں حضرت موسٰیؑ کے ذکر کے بعد حضرت نوحؑ کا ذکر آ گیا تھا، بیچ کے انبیاء میں سے کسی کا ذکر نہیں آیا تھا۔ اس سورہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت نے اس خلا کو بھر دیا۔ اس لیے کہ حضرت نوحؑ اور حضرت موسٰیؑ کے درمیان سب سے زیادہ جلیل القدر نبی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۹-۱۰۴

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۝۶۹ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝۷۰ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۝۷۱ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۝۷۲ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝۷۳ قَالُوْا

بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ﴿٧٤﴾ قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ
تَعْبُدُوْنَ ﴿٧٥﴾ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ﴿٧٦﴾ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ
اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٧﴾ الَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ﴿٧٨﴾ وَالَّذِيْ
هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ﴿٧٩﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ﴿٨٠﴾ وَالَّذِيْ
يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ﴿٨١﴾ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓـَٔتِيْ يَوْمَ
الدِّيْنِ ﴿٨٢﴾ رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ وَاجْعَلْ
لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿٨٤﴾ وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ
النَّعِيْمِ ﴿٨٥﴾ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ﴿٨٦﴾ وَلَا تُخْزِنِيْ
يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٨٧﴾ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ﴿٨٨﴾ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ
بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿٩٠﴾ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ
لِلْغٰوِيْنَ ﴿٩١﴾ وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ﴿٩٢﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ﴿٩٤﴾
وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ ﴿٩٥﴾ قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٩٦﴾
تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٩٧﴾ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٩٨﴾
وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ
حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾ فَلَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٢﴾ اِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۚ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ
الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٠٤﴾

ترجمہ آیات ۶۹-۱۰۴

اور ان کو ابراہیم کی سرگزشت سناؤ، جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ بھلا یہ تم لوگ کن چیزوں کی پرستش کرتے ہو! انھوں نے جواب دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر ان کی پوجا پر جمے رہیں گے! ۶۹-۷۱

اس نے کہا، کیا یہ تمھاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارتے ہو یا تمھیں نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں! انھوں نے کہا بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے ہوئے پایا ہے۔ ۷۲-۷۴

اس نے کہا، کیا تم نے ان چیزوں پر غور کیا ہے جن کو تم پوجتے رہے ہو، تم بھی اور تمھارے اگلے آباء واجداد بھی! یہ سب میرے تو دشمن ہیں، بجز اللہ رب العالمین کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہ میری رہنمائی فرماتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا دیتا ہے اور جو مجھے موت دے گا پھر مجھے زندہ کرے گا اور وہ جس سے میں متوقع ہوں کہ جزا کے دن میرے گناہ معاف کرے گا۔ ۷۵-۸۲

اے میرے رب! مجھے قوتِ فیصلہ عطا فرما اور مجھے زمرۂ صالحین میں شامل کر اور بعد والوں میں میرا نیک ذکر قائم رکھ اور مجھے باغِ نعمت کے وارثوں میں سے بنا۔ اور میرے باپ کی مغفرت فرما، بے شک وہ گمراہوں میں سے تھا اور جس دن لوگ اٹھائے جائیں گے اس دن مجھے رسوا نہ کیجیو۔ ۸۳-۸۷

جس دن نہ مال کام آوے گا اور نہ اولاد، بس وہ فائز المرام ہوں گے جو تندرست و پاک دل لے کر حاضر ہوں گے اور جنت خدا ترسوں کے لیے قریب لائی جائے گی اور دوزخ گمراہوں کے لیے بے نقاب کی جائے گی۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمھاری مدد کریں گے یا اپنا دفاع کریں گے!

پس وہ اس میں اوندھے جھونک دیے جائیں گے، وہ بھی اور سارے گمراہ بھی اور ابلیس کے سارے لشکر بھی۔ ۸۸ - ۹۵

اور وہ اس میں باہم جھگڑتے ہوئے کہیں گے، خدا کی قسم! ہم کھلی ہوئی گمراہی میں تھے جب کہ تم کو خداوند عالم کا ہمسر ٹھہراتے رہے۔ اور ہم کو تو بس مجرموں نے گمراہ کیا تو نہ اب ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی سرگرم دوست! پس ہمیں ایک مرتبہ اور لوٹنا نصیب ہو کہ ہم ایمان لانے والوں میں سے بنیں! ۹٦ - ۱۰۲

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان میں کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۰۳ - ۱۰۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ه اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ه قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِيْنَ (۶۹ - ۷۱)

سوال بطور استخفاف

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال استفہام کی نوعیت کا نہیں بلکہ استخفاف کی نوعیت کا تھا۔ یعنی یہ کیا فضول اور بے حقیقت چیزیں ہیں جن کی تم عبادت کرتے ہو! ان کی قوم نے ان کا جواب حمیت جاہلیت کے پورے جوش و غرور کے ساتھ دیا کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور تمھارے علی الرغم اسی طرح برابر ان کو پوجتے رہیں گے، تم کتنا ہی زور لگاؤ لیکن ہم اپنے ان معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔

قَالَ هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ه اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ه قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ (۷۲ - ۷۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے لیے سوال کیا کہ جب تم ان سے دعا و فریاد کرتے ہو تو کیا یہ تمھاری دعا و فریاد سنتے ہیں یا تمھیں کوئی نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں یا پہنچا سکتے ہیں تو آخر یہ کس مرض کی دوا ہیں کہ تم ان کی پرستش کرتے ہو! قوم کے لوگوں نے جواب دیا کہ یہ باتیں ہم نہیں جانتے۔ بس ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے پایا ہے، سو ہم اسی طرح کرتے رہیں گے۔ اپنے آباء و اجداد کے طریقے کو ہم تمھارے کہنے سے نہیں چھوڑ سکتے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے اس دور کی باتیں نقل ہو رہی ہیں جب وہ تمام عقلی و نقلی اور آفاقی و انفسی دلائل سے اپنی قوم پر حجت تمام کر چکے ہیں۔ آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ اس کے بعد انھوں نے قوم سے اعلان برأت کر کے ہجرت فرمائی ہے۔ اس مرحلے میں ظاہر ہے کہ نبی کی دعوت کا انداز بدل جاتا ہے اور قوم کے جواب کا انداز بھی بدل جاتا ہے۔ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے اس کی نوعیت قوم کی عقل اور اس کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی آخری کوشش کی ہوتی ہے اور قوم جو کچھ جواب دیتی ہے اس کی نوعیت آخری ضد اور ہٹ دھرمی کے مظاہرے کی۔ یہ دونوں ہی باتیں یہاں سوال و جواب سے واضح ہو رہی ہیں۔

قَالَ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۝ فَاِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّيْٓ اِلَّا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۷۵-۷۷)

حضرت ابراہیمؑ کا اعلان برأت

'اَفَرَءَيْتُمْ' کے اسلوب میں تعجب اور اظہار نفرت و بیزاری کا مضمون پایا جاتا ہے۔ یعنی ذرا ان چیزوں پر نگاہ تو ڈالو جن کو تمھارے باپ دادا پوجتے رہے اور جن کی پرستش پر تمھیں بھی ناز ہے، یہ بالکل بے حقیقت چیزیں ہیں۔ ان کے بارے میں میرا یہ فیصلہ سن لو کہ یہ ساری چیزیں میری دشمن ہیں اور میں ان سے بیزار ہوں۔ میں اللہ رب العالمین کے سوا کسی چیز کی پرستش نہیں کرتا۔ "یہ چیزیں میری دشمن ہیں" یعنی یہ شیطان کے ایجاد کیے ہوئے پھندے ہیں اور شیطان بنی نوع انسان کا دشمن ازلی ہے جس کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ خلق خدا کو صراط مستقیم سے روکے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا وہ اعلان براءت ہے جس کے بعد انھوں نے ہجرت فرمائی۔ سورۂ والصافات، میں ان کا کلمہ ہجرت یوں نقل ہوا ہے 'اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ (۹۹)' (میں اپنے رب کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہنمائی فرمائے گا) اسی ہجرت کا اعلان عنکبوت کی آیت ۲۶ میں ہے۔ پیغمبر اپنے ماحول کا نہایت خیر خواہ، دوست، مشفق اور ہمدرد ہوتا ہے لیکن جب ماحول خود اس کا دشمن بن جاتا ہے اور اس کی ہدایت کی قدر کرنے کے بجائے اس سے اپنی ضلالت کی قدر کرانا چاہتا ہے تو وہ ان کو اپنا دشمن سمجھ کر اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کا دشمن ہوں بلکہ یوں فرمایا کہ وہ میرے دشمن ہیں۔

اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ هُوَ يُطْعِمُنِيْ وَيَسْقِيْنِ ۝ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ ۝ وَالَّذِيْ يُمِيْتُنِيْ ثُمَّ يُحْيِيْنِ ۝ وَالَّذِيْٓ اَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لِيْ خَطِيْٓئَتِيْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۷۸-۸۲)

ربِّ حقیقی کی صفات

اپنی قوم کے بتوں کی بے حقیقتی واضح کرنے کے بعد یہ حضرت ابراہیمؑ نے اس رب حقیقی کی صفات بیان فرمائی ہیں جو عبادت و اطاعت کا اصلی حق دار ہے۔

عقلی پرورش

'اَلَّذِيْ خَلَقَنِيْ فَهُوَ يَهْدِيْنِ' یعنی میری عبادت کا اصلی حق دار وہ ہے جس نے مجھے

پیدا کیا اور وہ میری رہنمائی فرماتا ہے۔ یہ بیان واقعہ بھی ہے اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ خلق اور ہدایت میں لزوم عقلی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں صرف پیدا ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس نے ہمارے اندر نہایت اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت فرمائیں اور پھر ہمیں ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے اور اُجاگر کرنے کا سلیقہ عطا فرمایا۔ اس نے ہمیں نہایت اعلیٰ فطرت پر پیدا کیا اور ہمیں عقل عطا فرمائی جو حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کرنے والی اور جزئیات سے کلیات اور محسوسات سے معقولات تک پہنچنے والی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی ہ وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی' (اعلیٰ: ۲-۳) (جس نے ہمارا خاکہ بنایا پھر اس کے نوک پلک سنوارے اور جس نے ہمارے اندر صلاحیتیں ودیعت فرمائیں، پھر ان کے استعمال کے لیے ہماری رہنمائی فرمائی)۔

روحانی پرورش

یہ ہدایت خدا کی صفتِ خلق کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، لازمی تقاضا ہے۔ جس خدا نے اس اہتمام اور اس حکمت کے ساتھ انسان کو پیدا کیا ہے اس کی رحمت و حکمت سے یہ بات بعید تھی کہ وہ پیدا کر کے اس کو یوں ہی بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ نہ صرف ایک کارِ عبث ہوتا بلکہ یہ ایک ظلم بھی ہوتا جو اس کی شان کے منافی ہے۔ اس وجہ سے اس نے جس طرح انسان کی تمام مادی ضروریات کا اہتمام فرمایا اسی طرح اس کی اس روحانی ضرورت کا بھی اہتمام فرمایا اور چونکہ انسان کے اصلی کمال کا انحصار اس کی اسی ضرورت کے کما حقہٗ پورے ہونے پر تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس معاملے کو تنہا اس کی عقل پر نہیں چھوڑا بلکہ اس کی ہدایت کے لیے نبوت و رسالت کا انتظام بھی فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ عبادت کی سزاوار وہ ذات ہے جو ان تمام افضال و عنایات کا منبع ہے نہ کہ یہ پتھر کی مورتیں جو نہ سنتی ہیں نہ دیکھتی ہیں، نہ نفع پہنچا سکتی ہیں نہ نقصان!

مادی پرورش

'وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ہ وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ' روحانی و عقلی ربوبیت کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کی مادی پرورش کی طرف توجہ دلائی کہ میرا رب وہ ہے جو مجھے کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں کبھی بیمار پڑ جاتا ہوں تو وہ اپنے فضل و رحمت سے مجھے شفا بخشتا ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرک قومیں اپنے معبودوں کو کائنات کا خالق و مالک نہیں مانتی رہی ہیں بلکہ وہ ان کو رزق و فضل کا ذریعہ سمجھتی رہی ہیں اور خاص طور پر اس وہم کو ان کے شرک میں بڑا دخل رہا ہے کہ بیماری ان کی ناراضگی سے لاحق ہوتی ہے اور شفا ان کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کے ان اوہام پر بھی ضرب لگائی کہ ان میں سے کسی چیز میں بھی ان اصنام کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ ساری چیزیں اس کائنات کے رب کے اختیار میں ہیں۔

'وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ' کا اسلوب بیان بھی قابلِ توجہ ہے۔ کھلانے، پلانے اور شفا دینے

کے افعال کی نسبت تو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف فرمائی لیکن بیمار ہونے کی نسبت اپنی طرف فرمائی۔ اس کی وجہ سوءِ ادب سے احتراز بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ نعمتیں جس قدر بھی بندے کو ملتی ہیں وہ سب خدا کے فضل و جود سے ملتی ہیں لیکن اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ بسا اوقات اس کے کسی عمل پر مترتب ہوتی ہے۔ ہر چند وہ پہنچتی تو خدا کے اذن و حکم ہی سے ہے لیکن اس میں انسان کی اپنی غفلت کو بھی دخل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ بندے کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی پہلو کو مدنظر رکھ کر یہاں یہ فرمایا کہ "جب میں بیمار پڑتا ہوں" یہ نہیں فرمایا کہ "وہ مجھے بیمار کرتا ہے"۔

پرورش و ہدایت سے روزِ جزا کی دلیل

وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ۔ یہ اس خلق و ہدایت اور اہتمام ربوبیت کے لازمی نتیجہ کی طرف توجہ دلائی کہ وہی ہے جو مجھے ایک دن موت دے گا اور پھر لازماً اس کے بعد ایک دن زندہ بھی کرے گا۔ جب اس نے مجھے پیدا کیا اور اس میں اس کو کوئی مشکل پیش نہیں آئی تو دوبارہ زندہ کر دینے میں کیوں مشکل پیش آئے گی اور ایسا ہونا اس کے اس سارے اہتمام ہدایت و ربوبیت کا لازمی تقاضا بھی ہے۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہ میرے لیے ہدایت اور پرورش کا یہ اہتمام فرمائے اور پھر یہ زندگی یوں ہی تمام ہو جائے۔

وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۔ یہ اس روزِ جزا و سزا کے ظہور کی طرف اشارہ ہے جس سے اس دنیا کی زندگی کے بعد لازماً ہر شخص کو سابقہ پیش آنا ہے، لیکن حضرت ابراہیمؑ نے اس کے ظہور کی خبر دینے کی بجائے اپنی اس توقع کا اظہار فرمایا جو اپنے رب سے وہ اس دن کے پیش آنے پر رکھتے ہیں۔ گویا اس دن کا پیش آنا تو ایک بدیہی حقیقت ہے جس میں کسی شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے البتہ اس کے لیے ہر شخص کو تیاری کرنی چاہیے اور اپنے رب سے یہ امید رکھنی چاہیے کہ جو اس سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاریں گے وہ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا۔

حالات کے تقاضے سے ایک خاص اسلوبِ کلام

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کے سامنے اپنی دعوت کے تمام مبادی رکھ دیے ہیں جن کے اندر نہایت گہرا منطقی ربط بھی ہے لیکن انھوں نے ان کو پیش کرنے میں دعویٰ اور دلیل کا اسلوب اختیار کرنے کے بجائے اپنے ذاتی تاثرات کے اظہار کا انداز اختیار فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مرحلہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اعلانِ براءت و ہجرت کا تھا۔ اس مرحلے میں قوم کو مخاطب کر کے بحث و استدلال کے انداز میں کچھ کہنا بے سود تھا اس وجہ سے انھوں نے اپنے ذاتی تاثرات نہایت بلیغ انداز میں ان کے سامنے رکھ دیے کہ شاید اس طرح ان کے دل میں کوئی بات اتر جائے۔ اگر دلوں میں زندگی کی کچھ رمق ہوتی ہے تو یہ اسلوب بعض اوقات نہایت مؤثر ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی نہایت بلیغ مثالیں موجود ہیں۔

رَبِّ هَبْ لِیْ حُکْمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ لِسَانَ صِدْقٍ فِی الْاٰخِرِیْنَ (۸۳-۸۴)

ہجرت کے وقت حضرت ابراہیمؑ کی دعا

یہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی وہ دعا ہے جو اعلانِ برأت و ہجرت کے اس نازک موقع پر انھوں نے کی ہے۔

رَبِّ هَبْ لِيْ حُكْمًا۔ 'حُکْم' سے مراد، جیسا کہ آیت ۲۱ کے تحت گزر چکا ہے، وہ صحیح قوتِ فیصلہ ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کو خاص طور پر عطا ہوتی ہے۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ ایک نہایت اہم قدم اٹھا رہے تھے اور اس بات کے محتاج تھے کہ آگے کے تمام مراحل میں ان کو صحیح فیصلہ کی توفیق اور خدا کی رہنمائی حاصل ہو اس وجہ سے انھوں نے سب سے پہلے اسی کے لیے دعا فرمائی۔

'وَاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ' حق کی خاطر اپنے خاندان اور اپنی قوم سے بھی انھوں نے اعلانِ برأت فرما دیا تھا اس وجہ سے یہ دعا بھی فرمائی کہ ان بروں کی جگہ اچھوں کی معیت و رفاقت حاصل ہو۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

دعوت کے فروغ کے لیے حضرت ابراہیمؑ کی دعا

وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۔ 'لِسَان' کے معنی یہاں شہرت اور چرچا کے ہیں اور اس کی اضافت چونکہ 'صدق' کی طرف ہے اس وجہ سے اس سے مراد ذکرِ جمیل ہوگا بلکہ اس کے اندر پائیداری اور دوام و استمرار کا مفہوم بھی پیدا ہو جائے گا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعوت کے فروغ و استحکام کے لیے دعا فرمائی کہ آنے والی نسلوں میں وہ پھیلے اور اس کو پائیداری نصیب ہو۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کو جو قبولیت حاصل ہوئی تاریخ میں اس کی کوئی اور مثال موجود نہیں ہے۔ بنی اسرائیل میں جتنے نبی و رسول آئے سب انھی کی دعوت لے کر آئے اور آخر میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دعوت کو ایک عالمگیر اور زندہ جاوید دعوت بنا دیا۔

وَاجْعَلْنِيْ مِنْ وَّرَثَةِ جَنَّةِ النَّعِيْمِ ۝ وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝ وَلَا تُخْزِنِيْ يَوْمَ يُبْعَثُوْنَ (۸۵-۸۷)

آخر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے جنت کی اور اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا فرمائی۔

'وَلَا تُخْزِنِيْ الاٰیۃ' باپ کے حق میں ایک نہایت مؤثر سفارش ہے۔ آدمی کے اعزّہ و اقربا بالخصوص ماں باپ کی رسوائی خود اس کی رسوائی کے ہم معنی ہوتی ہے اس وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میرے باپ کی بھی مغفرت فرما کہ اس کا جہنم میں پڑنا آخرت میں میرے لیے رسوائی کا سبب نہ بنے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس دعا سے اپنے باپ کا حق انتہائی دلسوزی کے ساتھ ادا کر دیا لیکن اللہ تعالیٰ کا قانونِ عدل بالکل بے لاگ ہے۔ باپ کے حق میں ان کی دعا قبول نہیں ہوئی بلکہ بعد میں آپ کو اس کے لیے دعا کرنے سے بالکل روک دیا گیا۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ اَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ (۸۸-۸۹)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم کی بات کی تکمیل

یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا جزو نہیں ہے بلکہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کی تکمیل و توضیح ہے۔ فرمایا کہ اس دن کسی کے مال و اولاد اس کے کچھ کام نہیں آئیں گے، صرف وہی لوگ اللہ تعالیٰ کے ہاں باریاب ہوں گے جو قلبِ سلیم کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ کسی کی اولاد اگر کچھ کام آنے والی بن سکتی تو اس اعتبار سے آزر سے زیادہ خوش قسمت کون تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا فرزند عطا فرمایا لیکن جب وہ بھی اپنے باپ کے کچھ کام نہ آسکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

'قلب سلیم' سے مراد

'قلبِ سلیم' سے مراد شرک و نفاق کی ہر آلائش سے بالکل پاک اور محفوظ دل ہے۔ جس دل میں کسی اور کی حصہ داری یا نفاق کی بیماری ہو اس کی خدا کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ (۹۰-۹۱)

نیکوکاروں کی تشریف و تکریم

'اِزْلَافٌ' کے معنی قریب لانے کے ہیں۔ یہ نیکوکاروں کی تشریف و تکریم کی طرف اشارہ ہے کہ جنت ایک پیشکش کی طرح ان کے سامنے پیش کی جائے گی۔ اس دنیا میں انھوں نے جو نیکی کمائی اس کے صلے میں وہ ان کے لیے پہلے سے آراستہ و پیراستہ تیار ہوگی۔ اس دن انھیں اس کے لیے کوئی سفر نہیں کرنا پڑے گا بلکہ وہ خود ان کے سامنے لائی جائے گی۔ اسی طرح دوزخ بھی گمراہوں کے لیے بالکل تیار ہے۔ قیامت کے دن بس اس کا پردہ اٹھا دیا جائے گا اور جس چیز کو وہ نہایت بعید سمجھ کر اس سے بالکل نچنت رہے وہ دیکھ لیں گے کہ اس کے ظہور میں صرف پردہ اٹھنے کی دیر تھی۔

وَقِيْلَ لَهُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۝ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ هَلْ يَنْصُرُوْنَكُمْ اَوْ يَنْتَصِرُوْنَ (۹۲-۹۳)

بدکاروں کا حشر

'نَصْرٌ' کے معنی دوسرے کی مدد کرنے اور 'اِنْتِصَارٌ' کے معنی خود اپنی مدافعت کرنے کے ہیں۔

فرمایا کہ اس وقت دوزخ میں پڑنے والوں سے کہا جائے گا کہ تم خدا کے سوا جن کی پرستش کرتے رہے ہو، بتاؤ، اب وہ کہاں ہیں! کیا وہ تمھاری یا خود اپنی ہی کوئی مدافعت کر سکتے ہیں!

فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوٗنَ ۝ وَجُنُوْدُ اِبْلِيْسَ اَجْمَعُوْنَ (۹۴-۹۵)

'کَبٌّ' کے معنی منہ کے بل گرانے اور پچھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے 'کُبْکِبَ' ہے جس کے اندر حرف کی زیادتی نے مبالغہ کا مفہوم پیدا کر دیا ہے۔ یعنی اس تفضیح کے بعد وہ اور ان کے سارے اصنام و الٰہہ اور ان کے وہ لیڈر جن کی انھوں نے پیروی کی اور ابلیس کا سارا لشکر جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ لا تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۹۶-۹۸)

لیڈروں اور پیروؤں میں جھگڑا

'اِخْتِصَامٌ' کے معنی آپس میں لڑنے جھگڑنے کے ہیں۔ یہ جھگڑا جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات

میں تصریح ہے کہ وہ شرک کے علمبردار لیڈروں اور ان کے پیرووں میں ہوگا۔ پیرو لیڈروں سے کہیں گے کہ ہم نے تمھاری پیروی میں یہ روزِ بد دیکھا تو کیا آج تم ہمارے اس عذاب میں کچھ حصہ بٹاؤ گے؟ لیڈر جواب دیں گے کہ ہم جیسے خود تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی! اسی جھگڑے کی طرف اجمال کے ساتھ یہاں اشارہ فرمایا ہے کہ پیرو اپنے سر پیٹیں گے اور اپنے لیڈروں سے قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم کھلی ہوئی گمراہی میں رہے کہ ہم نے تم کو خداوند عالم کا ہمسر ٹھہرایا۔ اِذْ نُسَوِّیْکُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' کی تفسیر ابن کثیرؒ نے ان الفاظ میں کی ہے: ای نجعل امرکم مطاعا کما یطاع امورب العلمین (یعنی ہم تمھارے احکام کی اس طرح اطاعت کرتے رہے جس طرح خداوند عالم کے احکام کی اطاعت کرنی چاہیے تھی) یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین جن ہستیوں کی پرستش کرتے تھے، خواہ وہ فرشتے ہوں یا جنات، وہ تو محض ان کی مفروضہ خیالی ہستیاں تھیں اس وجہ سے ان سے کسی سوال و جواب کا معاملہ خارج از بحث ہے۔ قیامت کے دن ان کے پرستاروں پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ یہ محض ان کے اپنے رکھے ہوئے نام تھے جن کا کوئی مسمیٰ موجود نہیں ہے۔ البتہ جن لوگوں نے ان کی پرستش کی بنا ڈالی، جنھوں نے لوگوں کو خدا کی بندگی سے ہٹا کر ان کی طرف موڑا اور ان کی حمیت و حمایت میں خدا کے رسولوں کی تکذیب کی، وہ لوگ موجود ہوں گے۔ ان کو مخاطب کر کے ان کے پیرو وہ بات کہیں گے جو اوپر مذکور ہوئی۔

وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ ۝ فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَکُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ (۹۹-۱۰۲)

پیرووں کا ماتم اپنی بدبختی پر

اوپر والی بات تو پیرو اپنے لیڈروں کو مخاطب کر کے کہیں گے اور یہ باتیں وہ نہایت حسرت و اندوہ کے ساتھ خود اپنے آپ کو ملامت اور اپنی بدبختی پر ماتم کرتے ہوئے کہیں گے کہ ہمیں ان مجرموں ہی نے گمراہ کیا۔ اگر یہ نہ گمراہ کرتے تو ہم ہدایت پر ہوتے اور یہ روزِ بد نہ دیکھتے۔ قرینہ دلیل ہے کہ لفظ 'مُجْرِمُوْنَ' وہ اپنے لیڈروں کے لیے استعمال کریں گے۔

فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِیْنَ ۝ وَلَا صَدِیْقٍ حَمِیْمٍ۔ یہ اظہارِ حسرت کے الفاظ ہیں یعنی جن کی شفاعت کی امید پر زندگی بھر ان کی پرستش کی وہ بھی سب ہوا ہو گئے اور جن کا عمر بھر جھنڈا اٹھائے پھرے ان میں سے بھی آج کوئی ہماری حمایت و مدافعت کے لیے نظر نہیں آتا!

فَلَوْ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً الآیۃ۔ یہ وہ اپنی تمنا کا اظہار کریں گے کہ کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر دنیا میں جانا نصیب ہوتا کہ ہم ان مجرموں سے اظہار براءت کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے بنتے۔ لیکن ان کی یہ تمنا بس تمنا ہی رہے گی۔ اس کے پورے ہونے کا وقت ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔

ان آیات میں آبا و اجداد اور اپنے لیڈروں کی اندھی تقلید پر چلنے والوں کو اچھی طرح متنبہ کر دیا گیا ہے

کہ قیامت کے دن کسی کے لیے یہ عذر کچھ نافع نہیں ہو گا کہ اس کو دوسروں نے گمراہ کیا اس وجہ سے وہ گمراہی میں پڑ گیا، ہر شخص کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۝ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ (۱۰۳-۱۰۴)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

۶- آگے کا مضمون —— آیات ۱۰۵-۱۲۲

حضرت نوحؑ کی دعوت کا بیان

آگے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت، ان کی قوم کی طرف سے ان کی تکذیب اور اس کے نتیجہ میں قوم پر عذاب کا نزول اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۰۵-۱۲۲

کَذَّبَتۡ قَوۡمُ نُوۡحِ ۣالۡمُرۡسَلِیۡنَ ﴿۱۰۵﴾ اِذۡ قَالَ لَہُمۡ اَخُوۡہُمۡ نُوۡحٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۰۶﴾ اِنِّیۡ لَکُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِیۡنٌ ﴿۱۰۷﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۰۸﴾ وَ مَاۤ اَسۡـَٔلُکُمۡ عَلَیۡہِ مِنۡ اَجۡرٍ ۚ اِنۡ اَجۡرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۰۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوۡنِ ﴿۱۱۰﴾ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ لَکَ وَ اتَّبَعَکَ الۡاَرۡذَلُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾ قَالَ وَ مَا عِلۡمِیۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾ اِنۡ حِسَابُہُمۡ اِلَّا عَلٰی رَبِّیۡ لَوۡ تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۱۱۳﴾ وَ مَاۤ اَنَا بِطَارِدِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ﴿۱۱۵﴾ قَالُوۡا لَئِنۡ لَّمۡ تَنۡتَہِ یٰنُوۡحُ لَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمَرۡجُوۡمِیۡنَ ﴿۱۱۶﴾ قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوۡمِیۡ کَذَّبُوۡنِ ﴿۱۱۷﴾ فَافۡتَحۡ بَیۡنِیۡ وَ بَیۡنَہُمۡ فَتۡحًا وَّ نَجِّنِیۡ وَ مَنۡ مَّعِیَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۱۸﴾ فَاَنۡجَیۡنٰہُ وَ مَنۡ مَّعَہٗ فِی الۡفُلۡکِ الۡمَشۡحُوۡنِ ﴿۱۱۹﴾ ثُمَّ اَغۡرَقۡنَا بَعۡدُ الۡبٰقِیۡنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۲۱﴾ وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۲۲﴾

النصف

ع ۱۸/۶ ۱۰

ترجمۂ آیات ۱۰۵-۱۲۲

نوح کی قوم نے بھی رسولوں کی تکذیب کی، جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمھارے لیے ایک معتبر رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں اس پر تم سے کوئی صلہ نہیں مانگتا۔ میرا صلہ تو عالم کے خداوند کے ذمہ ہے تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ انھوں نے جواب دیا، کیا ہم تمھیں مان لیں اور حال یہ ہے کہ تمھاری پیروی رذیلوں نے کی ہے! اس نے کہا، مجھے اس کی کیا خبر جو وہ کرتے رہے ہیں؟ ان کا حساب کرنا تو میرے رب ہی کا کام ہے، اگر تم سمجھو! اور میں مومنوں کو دھتکارنے والا ہوں نہیں، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ ۱۰۵-۱۱۵

انھوں نے کہا، اے نوحؑ! اگر تم باز نہ رہے تو تم سنگسار ہو کر رہو گے۔ ۱۱۶

اس نے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے مجھے جھٹلا دیا تو میرے اور ان کے درمیان بالکل واضح فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے تو ہم نے اس کو اور اس کے ساتھ والوں کو بھری کشتی میں نجات دی۔ پھر اس کے بعد باقیوں کو ہم نے غرق کر دیا۔ ۱۱۷-۱۲۰

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے۔ اور ان کے اندر کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۲۱-۱۲۲

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحٍ الْمُرْسَلِينَ (۱۰۵)

قوم نوح نے تکذیب اگرچہ ایک ہی رسول ـــــ حضرت نوحؑ ـــــ کی کی تھی لیکن لفظ مُرسَلین

جمع استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ ردّ و قبول کے معاملے میں اصل اعتبار درحقیقت ردّ یا قبول کرنے والوں کی ذہنیت کا ہوتا ہے۔ جب تمام نبیوں کی دعوت ایک ہی رہی ہے جو حضرت نوحؑ نے دی تو جن لوگوں نے ان کی دعوت ردّ کر دی انھوں نے گویا ہر نبی و رسول کی دعوت ردّ کر دی۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جس طرح تمام انبیاء کی دعوت یکساں رہی ہے اسی طرح ان کی تکذیب کرنے والوں کی ذہنیت بھی ہمیشہ یکساں رہی ہے۔ اور پھر اس کا انجام بھی ہمیشہ ایک ہی ہوا ہے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں یہ سرگزشت بیان ہوئی ہے تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذبین اس سے سبق حاصل کریں۔

إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ (۱۰۶-۱۰۷)

رسول امین

'أَلَا تَتَّقُونَ' میں دعوت بانداز انذار و تنبیہ ہے اور 'رَسُولٌ أَمِينٌ' میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ میں کوئی مفتری اور جھوٹا مدعی نہیں ہوں، جیسا کہ تم نے گمان کیا ہے، بلکہ خدا کا رسول ہوں اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ تمھیں وہی باتیں پہنچا رہا ہوں جن کے پہنچانے کا مجھے حکم ہوا ہے۔

فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۸)

تم سلامتی چاہتے ہو تو اپنی اس ضد اور سرکشی کو چھوڑو اور اللہ کی پکڑ سے ڈرو جس کا راستہ یہ ہے کہ میری بات سنو اور مانو اور ان سرکشوں کی پیروی سے باز آؤ جو تمھیں ہلاکت کی راہ دکھا رہے ہیں۔

وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ (۱۰۹-۱۱۰)

حقیقت پر غور کرنے کی ترغیب اور اظہار بے نیازی

اس ٹکڑے میں مخاطبوں کو حقیقت پر غور کرنے کے لیے ترغیب بھی ہے اور ساتھ ہی بے نیازی کا اظہار بھی۔ مطلب یہ ہے کہ میں یہ جو کچھ تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں محض تمھاری خیر خواہی کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں اس پر تم سے کسی صلے اور معاوضے کا طالب نہیں ہوں کہ تم اس سے گھبرا کر میری باتیں سننے سے گریز کرو۔ اگر تم میری باتیں سنو اور مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے۔ اس میں میرا کوئی ذاتی فائدہ نہیں ہے۔ میرا اجر میرے رب کے ذمہ ہے اور وہ مجھے اس سے محروم نہ فرمائے گا۔ خواہ تم میری بات مانو یا نہ مانو۔ تو میں تم سے پھر کہتا ہوں کہ اللہ کے غضب سے ڈرو اور میری مانو!

قَالُوا أَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْأَرْذَلُونَ (۱۱۱)

خوئے بدرا بہانہ بسیار

حضرت نوحؑ کی اس مخلصانہ اور دردمندانہ نصیحت کا جواب قوم کے متکبرین نے یہ دیا کہ تمھاری پیروی تو ہماری قوم کے اراذل و انفار نے کی ہے تو ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم اعیان و اشراف ہو کر ان کے پہلو بہ پہلو تمھاری مجلس میں بیٹھیں۔ مطلب یہ کہ اگر ہمیں اپنے قریب لانا چاہتے ہو تو پہلے ان لوگوں کو اپنے سے دور کرو۔ قوم کا یہ معارضہ اس بات کی دلیل ہے کہ جہاں تک حضرت نوحؑ کی دعوت کا تعلق ہے اس کی تردید کے لیے ان متمردین کے پاس کوئی بات باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ کسی صورت میں اپنی شکست

ماننے کے لیے بھی تیار نہیں تھے اس وجہ سے انھوں نے اپنی رعونت کی تسکین کے لیے آخر میں یہ بہانہ ڈھونڈ لیا کہ حضرت نوحؑ کے ساتھی غریب اور پست حال لوگ ہیں تو ہم ان کے ساتھی کس طرح بن سکتے ہیں! خوئے بدرا بہانہ بسیار!

قَالَ وَمَا عِلْمِىْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰى رَبِّىْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۱۱۲-۱۱۵)

شرافت و رذالت کا انحصار آدمی کے اعمال پر ہے

حضرت نوحؑ نے ان کے اس معارضے کا جواب دیا اور سبحان اللہ، کتنا بلیغ جواب دیا! فرمایا کہ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار تو آدمی کے عمل و کردار پر ہے نہ کہ نسب و خاندان اور مال و جائداد پر، تو مجھے کیا معلوم کہ اب تک ان کا عمل کیا رہا ہے؟ ان کے ماضی کا احتساب میرے رب کے ذمہ ہے۔ میرے سامنے تو ان کا حاضر ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے اور اس سے ڈرنے والے ہیں۔

لَوْ تَشْعُرُوْنَ، یعنی اگر اس حقیقت کا احساس تمھیں بھی ہوتا تو تم بھی وہی کہتے جو میں کہہ رہا ہوں لیکن تمھارے ذہنوں میں یہ خناس سمایا ہوا ہے کہ شرافت و رذالت کا انحصار مال و دولت پر ہے۔ اس وجہ سے ان کی غریبی تمھارے لیے قبول حق میں حجاب بن گئی ہے۔

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ مطلب یہ کہ اگر تم اپنے ایمان کی شرط یہ ٹھہراتے ہو کہ میں ان مومنوں کو اپنے پاس سے دھتکار دوں تو یہ تو میں کرنے سے رہا۔ اگر تم اس چیز کے سبب سے ایمان نہیں لاتے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ میں صرف ایک نذیر مبین ہوں۔ میں نے اپنا فرض انذار ادا کر دیا۔ اب جو ایمان نہیں لائے گا، اس کی مسئولیت خود اس پر ہے۔ اس کے باب میں مجھ سے کوئی پرسش نہیں ہوگی۔

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (۱۱۶)

قوم کی آخری دھمکی

بحث کے میدان میں پسپا ہو جانے کے بعد حضرت نوحؑ کی قوم نے ان کو یہ آخری دھمکی دی کہ اگر تم اپنی اس دعوت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ بالآخر ہم تم سے جان چھڑانے کے لیے تم کو سنگسار کر کے رہیں گے۔ الفاظ سے یہ بات صاف نکل رہی ہے کہ سنگسار کرنے کی دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ لیکن حضرت نوحؑ نے اس کی کوئی پروا نہیں کی بالآخر قوم نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا کہ ہماری دھمکی کو صرف دھمکی نہ خیال کرو ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کر گزریں گے۔

قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِىْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَيْنِىْ وَبَيْنَهُمْ فَتْحًا وَّنَجِّنِىْ وَمَنْ مَّعِىَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۱۷-۱۱۸)

حضرت نوحؑ کی دعا فتح و نصرت کے لیے

قوم کے اس فیصلہ کن اعلان کے بعد جب حضرت نوحؑ اس کے ایمان لانے سے بالکل مایوس ہو گئے

تب انھوں نے رسولوں کی معروف سنت کے مطابق، اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! میری قوم نے میری تکذیب کر دی تو اب تو میرے اور اس کے درمیان آخری فیصلہ فرما دے اور مجھ کو اور میرے ساتھ جو اہلِ ایمان ہیں ان کو نجات دے۔ 'فتحا' کی تاکید سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت نوحؑ نے یہ دعا اس فتح و نصرت کے ظہور کے لیے فرمائی ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم کی ہلاکت اور رسول اور اس کے ساتھیوں کی نجات کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

فَاَنْجَیْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِی الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ۝ ثُمَّ اَغْرَقْنَا بَعْدُ الْبٰقِیْنَ (۱۱۹-۱۲۰)

تیر بہدف دعا — حضرت نوحؑ کی یہ دعا بالکل صحیح وقت پر زبان سے نکلی اس وجہ سے تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی قوم کو جس عذاب کی دھمکی دی تھی وہ طوفان کی شکل میں نمودار ہوا جس نے ساری قوم کو غرق کر دیا، صرف حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی اس سے محفوظ رہے۔

'اَلْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ'۔ 'شحن' کے معنی کسی چیز کو پُر کرنے کے ہیں۔ یہاں کشتی کے لیے اس صفت کے ذکر سے مقصود بالاجمال ان چیزوں کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کو کشتی میں رکھنے کی حضرت نوحؑ کو ہدایت ہوئی تھی اور جن کی تفصیل دوسرے مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہ کشتی خاص اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان ساری چیزوں کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی جن کو طوفان سے بچانا مقصود تھا۔ چنانچہ وہ چیزیں اس میں بھر لی گئیں، باقی ساری چیزیں غرق ہونے کے لیے چھوڑ دی گئیں۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۲۱-۱۲۲)

ترجیع — یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کو کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے لیکن یہ ضدی اور ہٹ دھرم لوگ ہیں۔ یہ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں اور ان کی اکثریت کوئی بڑی سے بڑی نشانی دیکھ کر بھی ایمان لانے والی نہیں ہے۔ تمھارا رب جب چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے، وہ ہر چیز پر غالب ہے لیکن وہ ان کو اس لیے مہلت دے رہا ہے کہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ رحیم بھی ہے۔

۸- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۲۳-۱۴۰

حضرت ہودؑ کی دعوت کا بیان — یاد ہوگا، سابق سورہ میں دو جلیل القدر نبیوں ـــ حضرت موسیٰؑ اور حضرت نوحؑ ـــ کا ذکر کر کے درمیان کی قوموں کا ذکر صرف ان کا اجمالی حوالہ دے کر چھوڑ دیا تھا۔ اس سورہ میں آگے ان اقوام کے حالات کی تفصیل آرہی ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے رسولوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا اور بالآخر وہ کس انجام کو پہنچیں۔ ترتیب بیان بالکل تاریخی ہے اور ہر سرگزشت کے خاتمہ پر انھیں آیات کی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہیں۔ سب سے پہلے قوم عاد کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

آیات ۱۲۳-۱۴۰

كَذَّبَتْ عَادُ ۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ هُوْدٌ أَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ إِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ أَمِيْنٌ ﴿۱۲۵﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۲۶﴾ وَمَآ أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۚ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ أَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ اٰيَةً تَعْبَثُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَتَتَّخِذُوْنَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُوْنَ ﴿۱۲۹﴾ وَإِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوْنِ ﴿۱۳۱﴾ وَاتَّقُوا الَّذِيْٓ أَمَدَّكُمْ بِمَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ أَمَدَّكُمْ بِأَنْعَامٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ وَجَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۱۳۴﴾ إِنِّيْٓ أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۳۵﴾ قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ ﴿۱۳۶﴾ إِنْ هٰذَآ إِلَّا خُلُقُ الْأَوَّلِيْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۱۳۸﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَأَهْلَكْنٰهُمْ ۗ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۗ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۳۹﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۴۰﴾

ع ۸ / ۱۱

ترجمہ آیات ۱۲۳-۱۴۰

قوم عاد نے رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان کو آگاہ کیا کہ کیا تم لوگ ڈرتے نہیں! میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو! اور میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب تو ہوں نہیں، میرا اجر تو بس عالم کے رب کے ذمہ ہے۔ ۱۲۳-۱۲۷

کیا تم ہر بلندی پر عبث یادگاریں تعمیر کرتے رہو گے اور شاندار محل بناتے رہو گے گویا تمھیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ اور جب بھی تم کسی پر حملہ آور ہوتے ہو تو جبارانہ حملہ آور

ہوتے ہو، تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس نے ان چیزوں سے تمھیں مدد پہنچائی جن کو تم جانتے ہو۔ اس نے تمھاری مدد کی چوپایوں اور اولاد سے اور باغوں اور چشموں سے۔ بے شک میں تم پر ایک ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہوں۔ ۱۲۸-۱۳۵

انھوں نے جواب دیا، ہمارے لیے یکساں ہے، خواہ تم نصیحت کرو یا نصیحت کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ یہ بات تو بس اگلوں سے چلی آرہی ہے اور ہم پر ہرگز عذاب آنے والا نہیں ہے۔ تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تمھارا رب وہ غالب اور مہربان ہے۔ ۱۳۶-۱۴۰

۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ عَادُ ٱلْمُرْسَلِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (۱۲۳-۱۲۶)

تمام رسولوں کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے

'مُرْسَلِيْنَ' کے جمع لانے کی وجہ آیت ۱۰۵ کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ کسی ایک رسول کی تکذیب درحقیقت تمام رسولوں کی تکذیب ہے۔ اسی بنیاد پر قرآن نے اہلِ کتاب کے دعوائے ایمان کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے والا قرار دیا۔ تمام رسولوں کی دعوت اور ان کی ملت ایک ہے اس وجہ سے ان میں سے کسی ایک کو جھٹلانے والا سب کو جھٹلانے والا ہے۔

'اَخُوْهُمْ هُوْدٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام ان کے لیے کوئی اجنبی شخص نہیں تھے جس کے ماضی و حاضر سے وہ ناواقف ہوں بلکہ انھی کے بھائی بند اور انھی کے اندر وہ پلے بڑھے تھے۔ جس شخص کی پوری زندگی ان کے سامنے ہو اور اس میں کہیں حرف رکھنے کی گنجائش نہ ہو، اگر اس کو انھوں نے جھوٹا اور مفتری قرار دیا تو اس کو ان کی شامت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے!

وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ (۱۲۷)

بدکنے والوں کو ملامت

اس آیت کے اندر جو پہلو ترغیب و تودیع کے ہیں ان کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ مزید برآں اس میں ان بدکنے والوں کو ملامت بھی ہے جو حضرت ہودؑ کی بات سننے کے لیے کسی طرح تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ فرمایا کہ خدا کے بندو، میری بات سنو تو سہی، میں نے اس پر کوئی ٹکٹ تو نہیں لگا رکھا ہے جو تم پر گراں گزر رہا ہے، میرا اجر تو میرے رب کے ذمہ ہے، میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں، میں تو تمھیں یہ بالکل مفت دے رہا ہوں۔

أَتَبْنُونَ بِكُلِّ رِيعٍ آيَةً تَعْبَثُونَ ۝ وَتَتَّخِذُونَ مَصَانِعَ لَعَلَّكُمْ تَخْلُدُونَ (۱۲۸-۱۲۹)

'رِيعٌ' اس بلند زمین کو کہتے ہیں جو دور سے نظر آئے۔

'آيَةٌ' یہاں نشانی اور یادگار کے مفہوم میں ہے۔

'مَصَانِعُ' قلعوں اور گڑھیوں کے لیے بھی آتا ہے اور محلوں اور ایوانوں کے لیے بھی۔

'لَعَلَّكُمْ' فصیح عربی میں 'كَأَنَّكُمْ' یعنی گویا کہ کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔

فسادِ تمدّن پر تنبیہ

یہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کے فاسد تمدّن پر تنبیہ فرمایا کہ مکانوں اور عمارتوں کی تعمیر ضرورت کے لیے ہے نہ کہ محض نمائش اور تفاخر و تنافس کے لیے۔ تمہارا حال یہ ہے کہ شوقِ تعمیر کا جنون اس طرح تم پر مستولی ہے کہ تمہارا ہر دولت مند اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ ہر بلند اور خوش منظر جگہ پر اس کی دولت و ثروت کی کوئی یادگار اور اس کے قیام و تفریح کے لیے کوئی کوٹھی اور بنگلہ بن جائے۔ اور یہ کام کسی واقعی انفرادی یا اجتماعی ضرورت کو سامنے رکھ کر نہیں ہو رہا ہے بلکہ بالکل عبث، محض نمائش اور تفاخر کے لیے ہو رہا ہے۔ اور اس میں تمہارے انہماک کا یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ تم نے گزرگاہ کو منزل سمجھ کر یہیں ڈیرے ڈال دیے ہیں اور تمہاری ساری توجہ اسی کی تعمیر و ترقی پر مرکوز ہے۔ کسی کو ہوش ہی نہیں کہ اصل منزل آگے ہے اور اس کے لیے بھی کوئی تیاری ضروری ہے:

یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کے اعیان و امراء کو خطاب کر کے فرمائی ہے۔ جب آخرت کو نظر انداز کر کے صرف دنیا مطلوب بنتی ہے تو تمدّن کا مزاج بالکل فاسد ہو جاتا ہے۔ جن کے پاس وسائل و ذرائع ہوتے ہیں وہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری کوٹھی کے جنون میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کوئی قابلِ ذکر جگہ ایسی نہ رہ جائے جہاں ان کی کوئی شاندار یادگار تعمیر نہ ہو جائے۔ دوسری طرف حال یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں غرباء کے پاس سر چھپانے کے لیے جھونپڑے بھی نہیں ہوتے اور ان میں سے کتنے انھی شاندار کوٹھیوں کے سامنے فٹ پاتھوں پر سردی سے ٹھٹھر کر یا لُو سے جھلس کر مر جاتے ہیں۔

تمدن کا یہ فساد اول تو اس بات کا نتیجہ ہے کہ حاجیات و ضروریات سے پہلے لوگ کمالیات و تعیشات

کے میدان میں مقابلہ شروع کردیتے ہیں اور دوسرا سبب اس کا آخرت فراموشی ہے۔ حضرت ہودؑ نے یہاں فساد کے ان دونوں اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پہلے سبب کی طرف لفظ تَعۡبَثُوۡنَ اشارہ کررہا ہے اور دوسرے سبب کی طرف لَعَلَّکُمۡ تَخۡلُدُوۡنَ۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ہودؑ کی یہ تشخیص اگرچہ اپنی قوم کے تمدن سے متعلق ہے لیکن یہ ٹھیک ٹھیک ہماری قوم کے تمدن پر بھی منطبق ہورہی ہے۔ یہاں ان اشارات پر کفایت فرمائیے۔ اِنۡ شَآءَ اللّٰہ سورۂ نمل کی تفسیر میں ہم صالح اور فاسد تمدن پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

وَاِذَا بَطَشۡتُمۡ بَطَشۡتُمۡ جَبَّارِیۡنَ (۱۳۰)

فسادفی الارض پر تنبیہ

اوپر کی آیت میں قوم کے داخلی فسادِ مزاج کی طرف اشارہ تھا۔ یہ ان کے خارجی فساد فی الارض کی طرف اشارہ ہے۔ جنگ اگر محض اپنی قوت و صولت کے مظاہرے اور دوسروں کو مغلوب و محکوم بنانے کے لیے ہو تو یہ فساد فی الارض ہے۔ یہ جائز صرف اس صورت میں ہے جب یہ کسی شر و فساد کے مٹانے کے لیے ہو۔ اس صورت میں بلاشبہ یہ ایک بہت بڑی نیکی بلکہ خدا کی عبادت بن جاتی ہے۔ صالحین کے ہاتھوں دنیا میں جو جہاد ہوئے ہیں وہ ہمیشہ یا تو مدافعت میں ہوئے ہیں یا استیصالِ فتنہ کے لیے اور یہ دونوں صورتیں حمایتِ حق اور اعلائے کلمۃ اللہ کی ہیں۔ حضرت ہودؑ نے اپنی قوم کو اس برائی سے بھی روکنے کی کوشش کی۔ فرمایا کہ تمہاری جنگیں سب جبارانہ ہیں، تم دوسروں کو اپنا غلام و محکوم بنانے کے لیے خدا کی زمین میں خونریزی کرتے ہو جو فساد فی الارض ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِیۡۤ اَمَدَّکُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝ اَمَدَّکُمۡ بِاَنۡعَامٍ وَّبَنِیۡنَ ۝ وَجَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ ۝ اِنِّیۡۤ اَخَافُ عَلَیۡکُمۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ (۱۳۱-۱۳۵)

'فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ' یہ بات تقریباً ہر رسول سے قرآن میں منقول ہوئی ہے۔ یہ نہایت دلسوزی و دردمندی کے ساتھ قوم کو گویا آخری مرحلے میں تذکیر و تنبیہ ہے کہ اب بھی وقت گزرا نہیں ہے اللہ سے ڈرو، اپنی اس غلط روش سے باز آجاؤ اور اپنے مفسد لیڈروں کی پیروی کرنے کے بجائے میری بات مانو۔

انعام کے اندر استدراج کا پہلو

'وَاتَّقُوا الَّذِیۡۤ اَمَدَّکُمۡ بِمَا تَعۡلَمُوۡنَ' یہ حضرت ہودؑ نے قوم کو خدا کے جلال و جبروت کے بجائے اس کے انعامات کے حوالہ سے ڈرایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مال و اولاد اور باغوں اور چشموں کی جو نعمتیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں ان کو بتانے اور گنانے کی ضرورت نہیں ہے، تم خود اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے ہو۔ یہ نعمتیں جس نے دی ہیں اس لیے نہیں دی ہیں کہ تم آخرت کو پسِ پشت ڈال کر اور سرکش و جبار بن کر زمین میں پھیلو بلکہ اس لیے دی ہیں کہ اس کے شکرگزار اور فرمانبردار بن کر زندگی بسر کرو ورنہ یاد رکھو کہ ایک ہولناک دن کا عذاب تم پر منڈلا رہا ہے۔ اس عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً قوم پر آیا ہے۔

جن کے اندر خدا کی معرفت ہوتی ہے وہ اس کے ابتلاء سے زیادہ اس کے انعام کی صورت میں اس سے ڈرتے ہیں کہ مبادا اس انعام کا حق ادا نہ ہو سکے اور یہ انعام استدراج کی صورت اختیار کر لے لیکن خدا کے اس بھید کو بہت کم لوگوں نے سمجھا ہے۔

قَالُوْا سَوَآءٌ عَلَيْنَآ اَوَعَظْتَ اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ (۱۳٦)

قساوتِ قلب کی آخری حد

حضرت ہودؑ کی اس ساری دلسوزی و دردمندی اور اس تمام تذکیر و تنبیہ کا جواب، قوم نے نہایت تحقیر و استہزاء کے ساتھ یہ دیا کہ آپ ہمیں نصیحت فرمائیں یا نہ فرمائیں ہمارے لیے دونوں یکساں ہے۔ ہم بہر حال آپ کی بات ماننے والے نہیں ہیں۔ 'اَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوٰعِظِيْنَ' کے الفاظ پر اچھی طرح غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر ایک مخفی قسم کا طنز بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ماننا تو الگ رہا ہماری نگاہوں میں تو آپ کی اس بے قراری و بے چینی کی بھی کوئی وقعت نہیں ہے جو ہمارے مستقبل سے متعلق آپ ظاہر کرتے ہیں، ہم تو اس کو محض ایک خبط و جنون سمجھتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ بسا اوقات آدمی اپنے کسی ناصح مشفق کی نصیحت قبول کرنے سے گریز بھی کرتا ہے تو کم از کم اس کے دل میں ناصح کی ہمدردی و خیر خواہی کی قدر ہوتی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اس کی نصیحت قبول کر سکوں یا نہ کر سکوں لیکن یہ مجھے نصیحت کرتا رہے۔ لیکن یہ دل کی قساوت کی آخری حد ہے کہ آدمی نہ صرف یہ کہ ناصح کی بات قبول نہ کرے بلکہ اس کی ہمدردی اور دل سوزی کو بھی ٹھکرا دے۔ حضرت ہودؑ کی قوم نے یہی روش اختیار کی۔ جب انھوں نے نہایت دل سوزی کے ساتھ فرمایا کہ میں اپنی باتوں کی تم سے کوئی قیمت تو مانگ نہیں رہا ہوں، کم از کم میری بات سن تو سہی! قوم نے ان کی اس دردمندانہ التجا کا یہ جواب دیا کہ آپ اپنے گھر بیٹھو، ہمیں آپ کی ان نصیحتوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

اِنْ هٰذَآ اِلَّا خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ (۱۳۷ - ۱۳۸)

'خُلُقُ الْاَوَّلِيْنَ' وہ روایت جو پہلوں سے چلی آ رہی ہے۔

یعنی عذاب کا جو ڈراوا تم ہمیں سنا رہے ہو، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، اس سے پہلے بھی اس قسم کے ڈراوے سنائے جاتے رہے ہیں لیکن یہ محض ڈراوے تھے۔ نہ پہلے عذاب آیا نہ اب ہم پر کوئی عذاب آنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے جیسے وہمی لوگ اس قسم کی باتیں پہلے بھی کرتے رہے ہیں۔ ہم اس قسم کے فرضی اندیشوں میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ مضمون سورۂ مومنون: ۸۳ میں بھی گزر چکا ہے اور آگے سورۂ نمل آیت ٦۸ میں بدیں الفاظ آیا ہے۔ لَقَدْ وُعِدْنَا هٰذَا نَحْنُ وَاٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (اس کی دھمکی ہمیں بھی سنائی جا رہی ہے اور اس سے پہلے ہمارے آبا و اجداد کو بھی سنائی جا چکی ہے۔ یہ محض اگلوں کے فسانے ہیں)

غافلوں کا ایک عام بدبختی

یہ امر ملحوظ رہے کہ اس دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسے خلا کا نہیں گزرا ہے جس میں غافلوں کو جھنجھوڑنے

والوں نے عذاب اور قیامت سے لوگوں کو نہ ڈرایا ہو لیکن غافلوں نے ہمیشہ وہی روش اختیار کی جو قوم ہود نے اختیار کی۔ قیامت کو انھوں نے اس لیے افسانہ قرار دیا کہ اس کا ذکر تو چلا آرہا ہے لیکن وہ آتی نہیں۔ اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ نہ وہ آتی ہے، نہ آئے گی بلکہ یہ محض وہمیوں کا پھیلایا ہوا افسانہ ہے۔

اسی طرح قوموں پر جو عذاب آئے ان کی یاد دہانی بھی بالکل بے اثر رہی۔ وقت کے دانشوروں نے ان کی توجیہ یہ کر لی کہ اس طرح کے نرم و گرم دن تو قوموں کی زندگی میں پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ان کو ہمارے عقائد و اعمال سے کیا تعلق!

فَكَذَّبُوهُ فَأَهْلَكْنٰهُمْ ۗ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً ۖ وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُم مُّؤْمِنِينَ ۝ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ (۱۳۹-۱۴۰)

فرمایا کہ اس طرح انھوں نے ہود علیہ السلام کو جھٹلا دیا جس کے بعد ہم نے ان کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد وہی آیات ترجیع ہیں جو اوپر گزر چکی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور آپ کے مخاطبوں کے لیے تہدید و وعید ہے کہ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو تاریخ کی اس سرگزشت میں بہت بڑی نشانی موجود ہے۔ لیکن یہ لوگ ایمان نہ لانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں اور جو لوگ بہانے ڈھونڈتے ہیں سنتِ الٰہی کے مطابق ایک وقت خاص تک بہر حال ان کو بھی مہلت ملتی ہے لیکن وہ خدائے عزیز کی پکڑ سے کہاں بھاگ کر جا سکیں گے!

۱۰۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۴۱-۱۵۹

حضرت صالحؑ کی دعوت کا بیان

آگے قوم ثمود اور ان کے پیغمبر حضرت صالح علیہ السلام کی سرگزشت ہے اور آخر میں انہی آیات کی ترجیع ہے جن کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں جو یکسانی رہی ہے وہ بھی اس سے واضح ہے اور ان کی قوموں کے رویے اور ان کے انجام میں جو یک رنگی رہی ہے وہ بھی اس سے نمایاں ہے۔ اب بعینہٖ اسی روش کا مظاہرہ اپنے رسول کے ساتھ قریش کر رہے تھے تو آخر ان کا انجام اس سے مختلف کیوں ہوتا جو ان کے دوسرے پیشروؤں کا ہوا —— آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴۱-۱۵۹

كَذَّبَتْ ثَمُودُ الْمُرْسَلِينَ ۝۱۴۱ إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صٰلِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ ۝۱۴۲ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ۝۱۴۳ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ ۝۱۴۴ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلٰى رَبِّ

الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۴۵﴾ اَتُتْرَكُوْنَ فِیْ مَا هٰهُنَاۤ اٰمِنِیْنَ ﴿۱۴۶﴾ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ﴿۱۴۷﴾
وَّ زُرُوْعٍ وَّ نَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِیْمٌ ﴿۱۴۸﴾ وَ تَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ
بُیُوْتًا فٰرِهِیْنَ ﴿۱۴۹﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ﴿۱۵۰﴾ وَ لَا تُطِیْعُوْۤا اَمْرَ
الْمُسْرِفِیْنَ ﴿۱۵۱﴾ الَّذِیْنَ یُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ وَ لَا یُصْلِحُوْنَ ﴿۱۵۲﴾
قَالُوْۤا اِنَّمَاۤ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَاۤ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚۖ
فَاْتِ بِاٰیَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۵۴﴾ قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ
لَّهَا شِرْبٌ وَّ لَكُمْ شِرْبُ یَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۱۵۵﴾ وَ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَیَاْخُذَكُمْ عَذَابُ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۱۵۶﴾ فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ ﴿۱۵۷﴾
فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَ مَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ
مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱۵۸﴾ وَ اِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۱۵۹﴾ ع ۱۹ ۱۲

ترجمہ آیات ۱۴۱-۱۵۹

ثمود نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی صالحؑ نے ان کو متنبہ کیا کہ کیا تم لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے خدا کا ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کسی اجر کا طالب نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس عالم کے رب ہی کے ذمہ ہے۔ ۱۴۱-۱۴۵

کیا تم انہی نعمتوں میں جن میں یہاں ہو، ہر خطرے سے محفوظ، چھوڑے رکھے جاؤ گے! باغوں اور چشموں میں! کھیتیوں اور گتھم گتھا خوشوں والے کھجوروں کے باغوں میں! اور پہاڑوں میں تراش تراش کر خوش خوش گھر بناتے رہو گے! تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو اور حد سے گزر جانے والوں کی بات نہ مانو، جو ملک میں فساد

برپا کر رہے ہیں اور اصلاح نہیں کر رہے ہیں۔ ۱۴۶-۱۵۲

وہ بولے کہ تم تو بس ایک سحر زدہ معلوم ہوتے ہو۔ تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ تو تم کوئی نشانی لاؤ، اگر تم سچے ہو۔ ۱۵۳-۱۵۴

اس نے کہا، یہ ایک اونٹنی ہے۔ ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہے اور ایک معین دن کی باری تمہارے لیے ہے۔ اور اس کو کوئی گزند نہ پہنچائیو ورنہ تم کو ایک ہولناک دن کا عذاب آپکڑے گا۔ پس انھوں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو انھیں پچھتانا پڑا۔ بالآخر ان کو عذاب نے آدبوچا۔ بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۵۵-۱۵۹

۱۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۱۴۱-۱۴۴)

قوم کی تہمت کا جواب اور بدعمل لیڈروں کی پیروی سے احتراز کی ہدایت

بعینہٖ یہی آیات اوپر والی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔ حضرت صالحؑ کا یہ ارشاد کہ میں ایک رسول امین ہوں جواب ہے قوم کی اس تہمت کا کہ انھوں نے خدا کے رسول ہونے کا دعویٰ بالکل جھوٹ موٹ کیا ہے اور عذاب کا ڈراوا محض دھونس جمانے کے لیے سنا رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں کوئی جھوٹا مدعی اور مفتری نہیں ہوں بلکہ خدا کا رسول ہوں اور بے کم و کاست، پوری امانت داری کے ساتھ، تمھیں وہی سنا رہا ہوں جس کے سنانے کے لیے بھیجنے والے نے مجھے بھیجا ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ میں یہ تنبیہ ہے کہ اپنے گمراہ کرنے والے لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ۔ اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو ورنہ یاد رکھو کہ وہ روزِ بد دور نہیں ہے جس کی تمھیں خبر دے رہا ہوں۔

وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۴۵)

بے نیازی خدمت خلق کے لیے ایک لازمی شرط ہے

اس میں ترغیب و تودیع اور اظہارِ بے نیازی کے جو مختلف پہلو ہیں ان کی طرف پیچھے اشارہ

ہو چکا ہے۔ بے نیازی خدمتِ خلق کے لیے ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ لوگوں کی زبانیں بند کر دینا کسی کے بس میں نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء علیہم السلام نے برملا اس امر کا اعلان فرمایا کہ ہم تم سے کچھ مانگنے کے لیے نہیں بلکہ تمھیں دینے کے لیے آئے ہیں۔ یہ مقام ہے بہت مشکل لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں دعوتِ حق کو فروغ ایسے ہی بے نیازوں کے ذریعے سے ہوا ہے جو خلق سے کسی صلے کے طالب نہیں ہوتے ہیں۔

أَتُتْرَكُونَ فِي مَا هٰهُنَا آمِنِينَ ۝ فِي جَنّٰتٍ وَّعُيُونٍ ۝ وَّزُرُوعٍ وَّنَخْلٍ طَلْعُهَا هَضِيمٌ ۝ وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا فٰرِهِينَ (۱۴۶-۱۴۹)

نعمت کے ساتھ شکرِ نعمت نہ ہو تو وہ استدراج ہے۔

اوپر والی بات بطور تمہید تھی۔ یہ اس اصل خطرے سے حضرت صالحؑ نے قوم کو آگاہ فرمایا جو بالکل سامنے تھا لیکن دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں مغروروں کو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اپنی مادی فربہی کو اپنی صحت و توانائی گمان کیے بیٹھے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے آگاہ فرمایا کہ یہ فربہی صحت نہیں بلکہ ایک ناگہانی موت کا الارم ہے۔ اوپر حضرت ہودؑ کی سرگزشت میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ نعمت کے ساتھ اگر شکرِ نعمت موجود نہ ہو تو وہ استدراج ہے جو بالآخر قوم کے لیے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو توجہ دلائی اور الفاظ سے صاف واضح ہے کہ عین اس دور میں توجہ دلائی ہے جو قوم کی ترقی و عروج کا دور تھا۔

نعمت منعم کی ایک امانت ہے

'فِي مَا هٰهُنَا' سے اشارہ اس رفاہیت و خوش حالی کی طرف ہے جو قوم کو حاصل تھی۔ بعد کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ نعمت و رفاہیت اگر کسی کے لیے غفلت کا باعث ہو تو یہ اس کی بلادت کی دلیل ہے۔ ہر نعمت منعم کی شکرگزاری کا حق واجب کرتی ہے اور اس شکرگزاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ برابر چوکنا رہے کہ مبادا کسی نعمت کا حق ادا کرنے میں کوئی کوتاہی ہو جائے۔ نعمت کسی کا حق نہیں بلکہ منعم کی طرف سے ایک امانت ہے اس وجہ سے جس کی تحویل میں جتنی ہی زیادہ امانت ہو اس کو اتنا ہی زیادہ فکر مند اور بیدار رہنا چاہیے۔ اگر کوئی شخص نعمت پا کر نچنت ہو کر سو رہے کہ یہ نعمت اس کا حق ہے اور وہ اس میں عیش کرنے کے لیے پیدا ہوا ہے تو وہ نہایت احمق ہے۔ نعمت کے اندر بے فکری، جس کو آیت میں 'آمِنِينَ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے، بالآخر وہی نتیجہ پیدا کرتی ہے جو ریشم کے کیڑے کے سامنے آتا ہے کہ جو ریشم وہ اپنے اوپر تنتا ہے اسی کے اندر وہ گھٹ کر مرتا اور وہی اس کا کفن بنتا ہے۔ قرآن میں ربوبیت سے قیامت پر جو جگہ جگہ استدلال کیا گیا ہے اس میں بھی یہی پہلو ہے کہ ہر نعمت کے ساتھ مسئولیت لازمی ہے۔ اس پر انسان کی فطرت اور اس کی عقل گواہ ہے۔ صرف وہی اس کا انکار کر سکتے ہیں جن کی فطرت مسخ اور عقل ماؤف ہو چکی ہو۔

'طَلْعُهَا هَضِيمٌ' یعنی 'داخل بعضها فی بعض' وہ کھجوریں جن کے خوشے آپس میں گتھم گتھا ہوں۔

'فِيْ جَنّٰتٍ ...... طَلْعُهَا هَضِيْمٌ' یہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، 'فِيْ مَا هٰهُنَا' کے اجمال کی تفصیل ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ عرب میں اچھے باغ کا تصور یہ تھا کہ انگوروں، اناروں کا باغ ہو اور اس کے نیچے نہریں جاری ہوں۔ بیچ بیچ میں مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں اور کنارے کنارے کھجوروں کی باڑھ ہو۔ یہاں انہی اجزاء کو الگ الگ گنا کر سوال فرمایا ہے کہ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ یہ ساری چیزیں تمھیں دے کر باغ کا اصل مالک اس سے بالکل بے تعلق ہو کر بیٹھ رہا ہے اور اس کی بابت تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ یہی حقیقت تمثیل کی صورت میں، انجیلوں میں بھی بار بار واضح فرمائی گئی ہے۔

آخرت فراموشی کے ساتھ جو تمدن وجود میں آتا ہے اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے

'وَتَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا فٰرِهِيْنَ' 'فَرِهٌ' کے معنی خوش ہونے، مگن ہونے، اکڑنے اور اترانے کے ہیں۔ یہ حالت کسی کے نخوت اور عاقبت نااندیش ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اوپر لفظ 'اٰمِنِيْنَ' جو آیا ہے اسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے۔ چنانچہ سورۂ حجر کی آیت ۸۲ میں اسی مضمون کو 'اٰمِنِيْنَ' سے تعبیر فرمایا ہے۔

تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود نے فن سنگ تراشی میں بہت ترقی کی تھی۔ ان کے امراء و اغنیاء پہاڑوں کو ترشوا کر ان کے اندر اپنے لیے شاندار پہاڑی ایوان و محل بنواتے اور جس طرح اوپر قوم عاد کے ذکر میں گزرا ہے ان کا یہ ذوق بھی محض ان کے تفاخر کا نتیجہ تھا۔ لفظ 'فٰرِهِيْنَ' ان کے اس ذوق کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ محض تفاخر کے لیے دولت کا اسراف خدا اور آخرت سے بے فکری کا نتیجہ ہے اور اس سے جو تمدن وجود میں آتا ہے اس میں خلق کے لیے خیر و رفاہیت کا کوئی پہلو نہیں ہوتا اس وجہ سے قانون قدرت میں اس کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ وہ بہت جلد شاندار کھنڈروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو اسی خطرے سے آگاہ فرمایا کہ یہ نہ سمجھو کہ یہ جو کچھ تم بنا رہے ہو یہی بنانے کے لیے تم ہمیشہ چھوڑے رکھے جاؤ گے۔ اب اس کی مہلت تمام ہونے والی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ (۱۵۰-۱۵۲)

خدا سے ڈرنے اور لیڈروں سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

وہی تنبیہ جو آیت ۱۴۴ میں گزری ہے حضرت صالح علیہ السلام نے پھر دہرائی کہ اب بھی وقت باقی ہے، خدا سے ڈرو اور میری بات مانو۔ یہاں کھل کر یہ بات بھی فرما دی کہ اپنے ان لیڈروں کے چکمے میں نہ آؤ جو خدا کے حدود کو لانگ کر بہت دور نکل جا چکے ہیں۔ یہ ملک میں فساد برپا کر رہے ہیں۔ اگرچہ یہ مدعی اصلاح کے ہیں اور ان کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ یہ اصلاح کرتے لیکن یہ اصلاح نہیں کر رہے ہیں بلکہ اصلاح کے نام سے افساد کر رہے ہیں۔ ہم تفسیر سورۂ بقرہ میں یہ واضح

کر چکے ہیں کہ جس طرح اس کائنات کے بقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر ایک ہی خدا کا ارادہ کار فرما ہے اسی طرح اس زمین کی صلاح کا انحصار اس امر پر ہے کہ اس کے اندر اسی ایک خدا کا قانون چلے۔ اگر خدا کے قانون کے سوا کوئی اور قانون اور نظام اس میں چلایا جائے تو یہ اس زمین کے امن و عدل کو درہم برہم کرتا ہے اگرچہ اس کو کتنے ہی خوبصورت نام اور کتنے ہی نیک ارادے کے ساتھ چلایا جائے۔

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۝ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۚ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ (۱۵۳-۱۵۴)

حضرت صالحؑ کو ان کی قوم کا جواب

'مُسَحَّرٌ' میں 'مَسْحُوْرٌ' سے زیادہ مبالغہ ہے۔ قوم نے حضرت صالحؑ کی اس دردمندانہ تذکیر و تنبیہ کا یہ جواب دیا کہ تم ہم کو ایک بالکل ہی سحر زدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کسی نے تم پر ایسا جادو کر دیا ہے کہ تمھاری عقل بالکل ہی ماری گئی ہے جس کے سبب سے ہماری اس تہذیب و ترقی میں تمھیں ہر طرف خطرے ہی خطرے نظر آ رہے ہیں اور اس خطرے نے تم ہمیں بھی ڈرا رہے ہو۔ آخر تمھارے ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ہم تمھیں خدا کا رسول مان لیں اور تمھارے ڈراووں سے مرعوب ہو کر اپنی اس تمام تہذیب و ترقی کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں! تم بھی تو ہمارے ہی جیسے ایک انسان ہو۔ اگر خدا کو کوئی رسول ہی بھیجنا تھا تو آخر اس نے ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو رسول بنا کر کیوں بھیجا؟ کسی فرشتے یا کسی مافوق بشر ہستی کو کیوں نہیں بھیجا؟ بہر حال ہم تو تمھیں ایک جھوٹا اور لاف زن سمجھتے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ہمیں کوئی ایسی نشانی دکھاؤ جس کو دیکھ کر ہم جان جائیں کہ بے شک تم خدا کے رسول ہو، اگر ہم نے تمھاری بات نہ مانی تو ہم پر وہ عذاب آ جائے گا جس سے تم ڈرا رہے ہو۔

قَالَ هٰذِهٖ نَاقَةٌ لَّهَا شِرْبٌ وَّلَكُمْ شِرْبُ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَظِيْمٍ (۱۵۵-۱۵۶)

قوم کے لیے عذاب کی نشانی کا تعین

حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کے اس فیصلہ کن جواب کے بعد ایک اونٹنی کو، جو ہو سکتا ہے کہ انھی کی رہی ہو، نامزد کر دیا کہ یہ عذاب کی نشانی ہے۔ یہ عذاب کے مقابل میں ایک بند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر تم نے اس بند کو توڑا تو تم پر عذاب الٰہی آ دھمکے گا۔ خبردار اس کو کوئی گزند نہ پہنچا ئیو اور ساتھ ہی بطور امتحان یہ ہدایت بھی دے دی کہ مویشیوں کے پانی پلانے کے گھاٹ پر ایک دن پانی پینے کی باری اس کی ہوگی اور ایک دن تمھارے مویشیوں کے لیے خاص ہوگا۔ جو دن اونٹنی کی باری کا ہو اس میں کوئی اس سے مزاحم نہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے جانوروں کے پانی پلانے کا گھاٹ ایک ہی تھا۔ حضرت صالحؑ نے اس پابندی سے اس معاملے کو ایک سخت آزمائش بنا دیا تاکہ قوم کی جسارت پوری طرح بے نقاب ہو جائے۔ مقصود یہ دیکھنا تھا کہ اگر اس تنبیہ کے بعد بھی لوگوں نے اونٹنی کو گزند پہنچانے کی جسارت کی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے بعد وہ خود ان پر ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں رہیں گے

اور جب قوم رسول کے معاملے میں طغیان کی اس حد تک بڑھ جاتی ہے تو سنتِ الٰہی کے بموجب وہ عذاب کی گرفت میں آجاتی ہے۔

فَعَقَرُوْهَا فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ (۱۵۷)

ایک کی بدانشی سب کے لیے موجب عذاب

بھلا یہ اشرار اس پابندی کو کب گوارا کرنے والے تھے کہ ایک دن گھاٹ پر حضرت صالحؑ کی اونٹنی بلا شرکتِ غیرے، پانی پیے اور دوسرے دن وہ پلائیں۔ چنانچہ انھوں نے جسارت کرکے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اس فعل کا ارتکاب اگرچہ کیا ایک ہی شخص نے لیکن قرآن نے اس کو منسوب پوری قوم کی طرف کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کسی شرارت پر دوسرے راضی ہوں، اس کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب میں سب شریک ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں جو عذاب آیا وہ سب پر آیا۔

'فَاَصْبَحُوْا نٰدِمِیْنَ' عذاب کی تعبیر ہے۔ یعنی بالآخر انھیں اپنے کیے پر پچھتانا پڑا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اس جرم کے ارتکاب کے بعد وہ اس پر پچھتائے۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کے بعد ان کو تین دن کی مہلت ملی۔ یہ مہلت ظاہر ہے کہ اسی لیے ملی تھی کہ اگر اب بھی ان کو اپنے اس جرم کا احساس ہو جائے تو وہ توبہ و استغفار سے خدا کے عذاب سے اپنے کو بچا سکتے ہیں لیکن اس مہلت سے بھی انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۵۸-۱۵۹)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

۱۲۔ آگے کا مضمون ____ آیات ۱۶۰-۱۷۵

حضرت لوطؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت ہے۔ حضرت ہود اور حضرت صالح علیہما السلام نے اپنی اپنی قوموں کو ان کے تمدنی فساد پر متنبہ فرمایا اور حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو اس کی ایک نہایت شدید اخلاقی برائی پر متنبہ فرمایا —— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ برائیاں کبھی منفرد نہیں ہوتیں بلکہ یہ خدا اور آخرت سے بے خوفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہیں اس وجہ سے ان کا فساد زندگی کے ہر گوشے میں پھیلا ہوا ہوتا ہے البتہ قوموں کے مزاج اور ان کے ماحول کے اعتبار سے ان کا بروز کسی خاص پہلو میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس سورہ میں وہی نمایاں پہلو زیرِ بحث آئے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کو اس مہلک بیماری کے عواقب سے آگاہ کیا لیکن قوم نے ان کی باتوں کی کوئی پروا نہیں کی اور بالآخر اسی انجام کو پہنچی جس سے انھوں نے آگاہ کیا۔ اس سرگزشت کا خاتمہ بھی اسی ترجیع پر ہوا ہے جو اوپر گزر چکی

ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام سرگزشتوں کے سنانے سے مقصود ایک ہی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۶۰-۱۷۵

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿۱۶۲﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۴﴾ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ قَالُوْا لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ ﴿۱۶۷﴾ قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ رَبِّ نَجِّنِيْ وَاَهْلِيْ مِمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۷۰﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۱۷۲﴾ وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَاۗءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۱۷۳﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۷۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۷۵﴾

ع ۹ / ۱۶ / ۱۳

ترجمہ آیات ۱۶۰-۱۷۵

قوم لوط نے بھی رسولوں کی تکذیب کی۔ جب کہ ان کے بھائی لوط نے کہا کہ کیا تم لوگ خدا سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک دیانتدار رسول ہوں۔ تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ میں اس پر تم سے کسی صلے کا طالب نہیں ہوں۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۶۰-۱۶۴

کیا تم خلق میں سے مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو! اور تمہارے رب نے تمہارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑتے ہو! بلکہ تم لوگ نہایت ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو! ۱۶۵-۱۶۶

وہ بولے کہ اے لوط! اگر تم باز نہ آئے تو تم لازماً یہاں سے نکال چھوڑے جاؤ گے۔[۱۶۷]
اس نے کہا، میں تمہارے اس عمل سے سخت بیزار ہوں۔ اے رب! تو مجھے اور میرے اہل کو ان کے عمل کے انجام سے نجات دے۔ تو ہم نے اس کو اور اس کے سارے اہل کو نجات دی، صرف ایک بڑھیا پیچھے رہ جانے والوں کے ساتھ چھوڑ دی گئی۔ پھر ہم نے دوسروں کو ہلاک کر دیا اور ہم نے ان پر برسایا نہایت ہولناک برسانا۔ تو کیا ہی بری تھی وہ بارش جو ان پر برسی جن کو انجام سے آگاہ کیا جا چکا تھا! ۱۶۸-۱۷۳

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں۔ اور بے شک تیرا رب عزیز و رحیم ہے۔ ۱۷۴-۱۷۵

۱۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْــَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶۰-۱۶۴)

یہ آیات اوپر کی سرگزشتوں میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ (۱۶۵-۱۶۶)

قوم لوط کی دیوثیت

یہ ان کی سب سے بڑی معصیت کی طرف اشارہ ہے۔ ہم دوسرے مقام میں وضاحت کر چکے ہیں کہ امرد پرستی قوم لوط میں فیشن بن گئی تھی۔ یہ دیوثیت اگر کسی قوم میں فیشن کی حیثیت حاصل کر لے تو وہ قوم خدا کی زمین پر نجاست کا ایک ڈھیر بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ

'ذُکْرَان' کے بعد 'مِنَ الْعٰلَمِيْنَ' کے الفاظ سے قوم کے اندھے پن کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ خلق میں سے تمہیں اس مقصد کے لیے مرد ہی ملے حالانکہ اس ضرورت کے لیے خدا نے جو چیز بنائی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے بلکہ اندھوں کو بھی نظر آ سکتی ہے! ان کے اسی اندھے پن کی طرف

سورۂ نمل میں یوں اشارہ فرمایا ہے۔ اَتَأْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ۔ ۵۴ (کیا تم اس کھلی ہوئی بےحیائی کا ارتکاب کرتے ہو درآنحالیکہ تم آنکھیں رکھتے ہو!)

الٹی گنگا بہانے کا انجام

وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ۔ یہ اس اندھے پن کی وضاحت بھی ہے اور اس ذوقِ فاسد کا لازمی نتیجہ بھی۔ جن لوگوں کے اندر یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے ان کی فطرت بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ عورت کی رغبت ان کے اندر بالکل مردہ ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ بنجر کو سیراب کرتے اور کھیتوں کو خشک ہونے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر یہ الٹی گنگا بہانے کا جو نتیجہ نکلنا چاہیے وہ نکلتا ہے۔

'بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ'۔ یہ انتہائی غم و حسرت کا فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے جرم کے گھناؤنے پن کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہیں۔ تم فطرت کے تمام حدود توڑ کر بہت دور نکل گئے ہو!

قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ (۱۶۷)

قوم کی فیصلہ کن دھمکی

قوم نے اس تمام دلسوزی و دردمندی کا جواب یہ دیا کہ اے لوط! اگر تم اپنی اس نصیحت و ملامت سے باز نہ آئے تو یاد رکھو کہ تم یہاں سے نکال کر چھوڑے جاؤ گے! فقرے کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ اخراج کی یہ دھمکی پہلی دھمکی نہیں بلکہ آخری فیصلہ کن دھمکی ہے۔ یہ دھمکی وہ پہلے بھی دیتے رہے تھے۔ اس کی طرف قرآن میں اشارات موجود ہیں لیکن اس دھمکی کا انداز سابق دھمکیوں سے مختلف ہے۔ اب انھوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ اپنی زبان بند کرو ورنہ یاد رکھو کہ ہم تم کو نکالنے کی جو دھمکی دیتے رہے ہیں وہ پوری کر کے رہیں گے۔

قَالَ اِنِّيْ لِعَمَلِكُمْ مِّنَ الْقَالِيْنَ (۱۶۸)

'قلی' کے معنی شدید بغض و نفرت کے ہیں۔ حضرت لوطؑ نے قوم کی فیصلہ کن دھمکی کا جواب بھی بھرپور دیا۔ فرمایا کہ میں تو تمہارے اس عمل سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجھ سے بیزاری و عناد کا سبب یہ ہے کہ میں تمہارے اس عمل پر تمھیں ملامت کرتا ہوں تو تمہاری یہ دھمکی مجھے اس سے نہ روک سکتی اور نہ ذرا اس میں مجھے نرم کر سکتی۔ خوب کان کھول کر سن لو کہ میں اس سے شدید بغض و نفرت رکھنے والوں میں سے ہوں تو تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو، کر گزرو۔ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

دھمکی کا بھرپور جواب

'مِنَ الْقَالِيْنَ' میں لفظ جمع لانے سے کلام میں زیادہ زور پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہی تنہا اس سے بیزار نہیں ہوں بلکہ ہر وہ انسان جس کی فطرتِ سلیم اور عقلِ مستقیم ہے اس سے بیزار ہوگا اور میں انہی میں ہوں۔ میں تمہارے اس عمل کے ساتھ کسی طرح تمہارا ساتھی بننا گوارا نہیں کرتا۔

رَبِّ نَجِّنِیْ وَاَهْلِیْ مِمَّا یَعْمَلُوْنَ (۱۶۹)

حضرت لوطؑ کی دعا

'مِمَّا یَعْمَلُوْنَ' میں عربی زبان کے معروف قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے۔ یعنی مِن عقوبۃ ما یعملون' یا اس کے ہم معنی کوئی لفظ۔

حضرت لوطؑ نے قوم کی اس دھمکی کے بعد اندازہ فرما لیا کہ اب فیصلہ کی آخری گھڑی قریب آگئی ہے۔ ان لوگوں نے جب میرے نکالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ان پر عذاب بھی لازماً آئے گا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے متعلقین اور اپنے ساتھیوں کے لیے دعا مانگی کہ اے رب اس نابکار قوم کے اعمال کے نتیجے میں جو عذاب اس پر آنے والا ہے اس سے مجھ کو اور میرے اہل کو محفوظ رکھیو۔ لفظ 'اھل' پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں کہ اس کے اندر اتباع بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اگر کچھ لوگ حضرت لوطؑ پر ان کی قوم میں سے، ایمان لائے ہوں گے تو وہ بھی اس میں شامل ہیں۔

فَنَجَّیْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِیْنَ ۙ اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ ۚ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ ۚ وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهِمْ مَّطَرًا ۚ فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ (۱۷۰-۱۷۳)

اس کے بعد قوم لوط پر عذاب آگیا۔ اس عذاب کی نوعیت کی تفصیل ہم سورۂ حجر کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔

'عَجُوْز' سے مراد حضرت لوطؑ کی بیوی ہے جس کی ساری ہمدردیاں اپنی قوم کے ساتھ تھیں۔ اس وجہ سے حضرت لوطؑ کے اہل میں سے ہونے کے باوجود یہ عذاب کی گرفت میں آگئی۔ لفظ 'عَجُوْز' یہاں اس کے لیے بطور تحقیر استعمال ہوا ہے۔

قریش کو تنبیہ

'فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِیْنَ' میں قریش کے لیے انذار و تنبیہ ہے کہ جن لوگوں کو کسی رسول کے ذریعہ سے انذار کیا جاتا ہے اگر وہ اس انذار کو خاطر میں نہیں لاتے تو ان پر اسی طرح خدا کے غضب کی بارش ہوتی ہے اور یہ بارش نہایت ہی بُری بارش ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً ۭ وَمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ (۱۷۴-۱۷۵)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

۱۴- آگے کا مضمون ——— آیات ۱۷۶-۱۹۱

حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت کا بیان

آگے حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم اصحاب مدین کی سرگزشت ہے۔ جس طرح اوپر حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کے اخلاقی فساد پر اس کو متنبہ کیا اسی طرح حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو اس کے معاشی فساد پر متنبہ کیا لیکن اس قوم نے بھی اپنے رسول کے ساتھ وہی روش اختیار کی جو اس کی پیشرو قوموں نے

اختیار کی اور بالآخر اسی انجام سے دوچار ہوئی جس سے دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ یہ سرگزشت بھی اسی ترجیع پر تمام ہوئی ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے خاتمہ پر وارد ہوئی ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۷۶-۱۹۱

كَذَّبَ أَصْحَابُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِينَ ﴿١٧٦﴾ إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلَا تَتَّقُونَ ﴿١٧٧﴾ إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُونِ ﴿١٧٩﴾ وَمَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿١٨٠﴾ أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُخْسِرِينَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿١٨٣﴾ وَاتَّقُوا الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْأَوَّلِينَ ﴿١٨٤﴾ قَالُوا إِنَّمَا أَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِينَ ﴿١٨٥﴾ وَمَا أَنْتَ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا وَإِنْ نَظُنُّكَ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ﴿١٨٦﴾ فَأَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِنَ السَّمَاءِ إِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِينَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ رَبِّي أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوهُ فَأَخَذَهُمْ عَذَابُ يَوْمِ الظُّلَّةِ إِنَّهُ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿١٨٩﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً وَمَا كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿١٩٠﴾ وَإِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ ﴿١٩١﴾

ع ۱۶ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۷۶-۱۹۱

اصحاب الایکہ نے بھی رسولوں کی تکذیب کی جب کہ شعیب (علیہ السلام) نے ان کو آگاہ کیا، کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں! میں تمہارے لیے ایک امانت دار رسول ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری بات مانو۔ اور میں تم سے اس پر کوئی صلہ نہیں طلب کرتا۔ میرا صلہ تو بس خداوند عالم کے ذمہ ہے۔ ۱۷۶-۱۸۰

تم لوگ پورا پورا ناپ کرو اور خسارہ پہنچانے والوں میں سے نہ بنو اور صحیح ترازو سے

تولا کرو۔ اور لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو اور زمین میں مفسد بن کر نہ پھیلو اور اس ذات سے ڈرو جس نے تم کو بھی پیدا کیا اور تم سے پہلوں کو بھی۔ ۱۸۱-۱۸۴

انھوں نے جواب دیا کہ تم تو ایک بالکل سحر زدہ ہو۔ اور تم تو بس ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو۔ اور ہم تو تم کو بالکل جھوٹوں میں سے خیال کرتے ہیں۔ ۱۸۵-۱۸۶

تو اگر تم سچے ہو تو ہم پر آسمان سے ٹکڑے گراؤ۔ اس نے کہا، میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو تو انھوں نے اس کو جھٹلا دیا پس ان کو بادل والے دن کے عذاب نے آدبوچا اور بے شک وہ ایک ہولناک دن کا عذاب تھا۔ ۱۸۷-۱۸۹

بے شک اس کے اندر بہت بڑی نشانی ہے اور ان کے اکثر ایمان لانے والے نہیں ہیں اور بے شک تیرا رب بڑا ہی عزیز و رحیم ہے۔ ۱۹۰-۱۹۱

۱۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَ اَصۡحٰبُ لۡئَيۡكَةِ الۡمُرۡسَلِيۡنَ (۱۷۶)

'اَیۡکَۃ' جھاڑی، بن اور جنگل کو کہتے ہیں۔ مدین کے پاس ایک جنگل بھی تھا اس وجہ سے اصحاب مدین، اصحاب الایکہ کے نام سے بھی مشہور تھے۔ بعض مفسرین نے اصحاب الایکہ اور اصحاب مدین کو دو الگ الگ قومیں سمجھا ہے اور ان کا خیال یہ ہے کہ حضرت شعیبؑ کی بعثت ان دونوں قوموں کی طرف ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ بات صحیح نہیں ہے۔

'اصحاب ایکہ' سے مراد اہل مدین ہیں

اِذۡ قَالَ لَهُمۡ شُعَيۡبٌ اَلَا تَتَّقُوۡنَ ۚ اِنِّىۡ لَـكُمۡ رَسُوۡلٌ اَمِيۡنٌ ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ۚ وَمَاۤ اَسۡـئَلُكُمۡ عَلَيۡهِ مِنۡ اَجۡرٍ‌ ۚ اِنۡ اَجۡرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ (۱۷۷-۱۸۰)

یہ آیات اوپر کی سرگزشت میں گزر چکی ہیں اور وہاں ان کے ہر جزو کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اَوۡفُوا الۡكَيۡلَ وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُخۡسِرِيۡنَ ۚ وَزِنُوۡا بِالۡقِسۡطَاسِ الۡمُسۡتَقِيۡمِ (۱۸۱-۱۸۲)

اصحاب مدین تجارت پیشہ تھے اور اس پیشے میں انھوں نے بڑی ترقی کر لی تھی لیکن جب خدا اور آخرت سے غفلت ہو تو شیطان ہر چیز کے اندر گھس کر فساد پیدا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے

ناپ تول میں کمی نظام کائنات کے منافی ہے

اندر ناپ تول میں کمی کرنے کی بیماری پھیل گئی۔ یہ معاشی فساد ایک شدید قسم کی متعدی بیماری ہے جو کسی قوم میں پیدا ہو جائے تو ہر دکاندار اور ہر تاجر اس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر بے ایمانی، ناپ تول میں نہ مارنی ملاوٹ، تہ بازاری اور چور بازاری کی ایسی ایسی شکلیں ایجاد ہو جاتی ہیں کہ معاشرے کا ہر شخص چیخ اٹھتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک میزان کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اسی میزان پر یہ آسمان و زمین قائم ہیں۔ اگر یہ درہم برہم ہو جائے تو یہ آسمان و زمین درہم برہم ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ نظام انسانوں کو یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ بھی اپنے اندر ہر شعبۂ زندگی میں صحیح میزان کے قیام کا پورا پورا اہتمام رکھیں ورنہ ان کا سارا معاشی و معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ یہاں اشارے پر کفایت کیجیے۔ ان شاء اللہ سورہ رحمان کی تفسیر میں ہم اس نکتہ پر وضاحت سے گفتگو کریں گے۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ (۱۸۳)

اشیاء میں ملاوٹ

یعنی ناپ تول میں کمی اور ڈنڈی ماری کر کے لوگوں کی چیزوں میں کمی نہ کرو۔ اسی کی ایک نہایت ہی مجرمانہ صورت اشیاء میں ملاوٹ بھی ہے کہ کوئی شخص گندم میں جَو، گھی میں چربی، شکر میں ریت، گوشت میں چھیچھڑے اور دودھ میں پانی ملا کر فروخت کرے۔ اس طرح وہ بظاہر خریدار کو وزن یا پیمانہ کے اعتبار سے تو چیز پوری کر دیتا ہے لیکن اس کے اندر اصل شے ایک ثلث کے بقدر بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ اور اس میں مضرِ صحت اشیاء کی جو ملاوٹ ہوتی ہے وہ مزید براں۔ یہاں تک کہ آدمی بازار کی کوئی چیز کھاتا ہے تو اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے کہ وہ کوئی کھانے کی چیز کھا رہا ہے یا زہر نگل رہا ہے۔

حرام خوری کا ٹوٹا پاراس آنے والی چیز نہیں ہے

وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ یعنی میزانِ حق و عدل کو درہم برہم کر کے اگر تم نے دنیا میں ترقی کی تو یہ ترقی کوئی مبارک ترقی نہیں ہے۔ دنیا میں بڑھو تو مفسدین کر نہ بڑھو بلکہ مصلح بن کر پھلو پھولو۔ اگر حرام کی نفع اندوزی سے موٹے ہوئے تو یہ ٹھاپا راس آنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کا انجام نہایت مہلک ہوگا۔

وَاتَّقُوا الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ (۱۸۴)

خدا کے ہاں سب کے لیے ایک ہی باٹ اور ترازو ہے

جِبِلَّۃ کے معنی خلق و خلقت کے ہیں۔ یہ حضرت شعیبؑ نے تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی کہ جس خالق نے اگلوں کو پیدا کیا اسی نے تم کو بھی پیدا کیا ہے۔ اگر اس نے اگلوں کو تمدن و معاشرت میں فساد پیدا کرنے کے سبب سے نیست و نابود کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ تمہارے معاملے میں اس کی سنت بدل جائے اور وہ تمہیں تمہارے اس معاشی فساد پر سزا نہ دے۔ اگر تمہارا خدا ان کے خدا سے کوئی الگ ہوتا تب تو تم یہ توقع کر سکتے تھے کہ تمہارے لیے اس نے کوئی الگ قانون بنایا ہوگا لیکن خدا وہی ہے اور لاریب وہی ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس کے پاس اگلوں کے لیے کوئی اور باٹ اور ترازو ہو تمہارے لیے کوئی اور۔ خدا تو سب کے لیے ایک ہی ترازو سے تولے گا تو اس سے ڈرو اور اپنی اس روش کی اصلاح کرو۔

قَالُوۡۤا اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مِنَ الۡمُسَحَّرِيۡنَ ۙ وَمَاۤ اَنۡتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا وَاِنۡ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الۡكٰذِبِيۡنَ ۚ فَاَسۡقِطۡ عَلَيۡنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِيۡنَ (۱۸۵-۱۸۷)

مکذبین کا مطالبۂ عذاب

قوم نے حضرت شعیبؑ کی اس دردمندانہ تنبیہ کا وہی جواب دیا جو دوسرے رسولوں کے مکذبین سے منقول ہوا ہے۔ اول یہ کہ یہ الٹی پلٹی باتیں جو تم کر رہے ہو یہ اس بات کا قرینہ ہیں کہ تم پر کسی نے نہایت سخت قسم کا جادو کر دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جب تم ہمارے ہی جیسے ایک بشر ہو تو ہم تمہیں خدا کا بھیجا ہوا رسول کس طرح مان لیں؟ تیسرا یہ کہ اگر تم سچ مچ رسول ہو، اگر ہم نے تمہاری بات نہ مانی تو ہم پر آسمان ٹوٹ پڑے گا تو ہم پر آسمان سے کچھ ٹکڑے گرا کر دکھاؤ۔ 'کِسَفٌ' جمع ہے 'کِسْفَۃٌ' کی۔ دوسری سورتوں میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضرت شعیبؑ نے قوم کو آگاہ کیا تھا کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تم پر اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب عاد، ثمود اور قوم لوط پر آئے۔ ان کے اس انذار کے جواب میں قوم نے ان کے سامنے یہ مطالبہ رکھ دیا۔

قَالَ رَبِّيۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ (۱۸۸)

حضرت شعیبؑ کی طرف سے تفویض الی اللہ

یہ تفویض الی اللہ کا کلمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے ٹکڑے گرانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ تمہاری کارستانیوں سے اچھی طرح باخبر ہے تو میں اس معاملے کو اسی کے حوالہ کرتا ہوں۔ اس کی حکمت کا جو تقاضا ہو گا وہ ظہور میں آئے گا اور بالکل ٹھیک وقت پر ظہور میں آئے گا۔

فَكَذَّبُوۡهُ فَاَخَذَهُمۡ عَذَابُ يَوۡمِ الظُّلَّةِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ (۱۸۹)

عذاب یوم الظلۃ

قوم شعیب کے عذاب کی نوعیت ہم سورۂ اعراف آیت ۹۱ کی تفسیر کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ تفصیل کے طالب وہاں دیکھ لیں۔ اس عذاب کی تعبیر سورۂ ہود آیت ۹۴ میں لفظ 'صَیْحَۃ' سے کی گئی ہے جس کے معنی ڈانٹ اور کڑک کے ہیں۔ پھر اسی کی تعبیر یہاں 'عَذَابُ یَوْمِ الظُّلَّۃِ' سے کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عذاب دور سے دیکھنے میں غبار یا ابر یا دھوئیں کا ایک ستون یا سائبان کی شکل میں نظر آیا۔ یہ قرینہ جیسا کہ ہم قوم لوط کی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں 'حَاصِب' کے عذاب کا ہے۔ 'حَاصِب' کے عذاب میں 'حَاصِب'، 'رَجْفَۃ'، 'صَیْحَۃ' اور 'ظُلَّہ' سب جمع ہو جاتے ہیں۔

اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ؕ وَمَا كَانَ اَكۡثَرُهُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ ۙ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الۡعَزِيۡزُ الرَّحِيۡمُ (۱۹۰-۱۹۱)

یہ آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر ہر سرگزشت کے بعد آئی۔

۱۶- آگے کا مضمون —— آیات ۱۹۲-۲۲۷

خاتمۂ سورہ

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں اور سلسلۂ کلام، سورہ کی تمہید، یعنی اصل عمود، سے جڑ گیا ہے

وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ قرآن کا کتاب الٰہی ہونا بالکل واضح ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے کے لیے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں وہ محض نہ ماننے کا ایک بہانہ ڈھونڈ رہے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو کوئی ایسی نشانی بھی ان کو دکھا سکتا ہے جس کے آگے ان کی اکڑی ہوئی گردنیں جھک جائیں لیکن وہ چاہتا ہے کہ اس طرح کی کوئی نشانی دیکھنے کے بجائے یہ عقل و بصیرت سے کام لیں۔

تاہم اگر ان کی یہی ہٹ دھرمی قائم رہی تو قرآن ان کو جن خطرات سے آگاہ کر رہا ہے ان میں سے ایک ایک خطرہ ان کے سامنے آکے رہے گا۔ اس کے بعد اسی حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کی سرگزشتیں شروع ہوگئی تھیں کہ اگر ان کو کسی نشانی ہی کی طلب ہے تو ان واقعات سے کیوں سبق نہیں لیتے؟ ان میں سے ہر واقعہ کے اندر نشانی موجود ہے۔ اگر انہی قوموں کی روش انھوں نے بھی اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کے ساتھ خدا کا معاملہ اس سے مختلف ہو جو ان قوموں کے ساتھ ہوا۔ سرگزشتوں کا یہ سلسلہ حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کی سرگزشت پر ختم ہوا۔ اس کے بعد تاریخی اعتبار سے حضرت موسٰیؑ کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ ان کی سرگزشت چونکہ اوپر نہایت تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکی تھی اس وجہ سے یہاں اس کو نہیں لیا بلکہ کلام اصل عمود کی طرف لوٹ آیا کہ یہ قرآن خدا کا اتارا ہوا کلام ہے۔ یہ کوئی شیطانی القاء نہیں ہے اور نہ یہ کوئی شاعری ہے۔ اس کی پیشین گوئیاں پچھلے صحیفوں میں بھی موجود ہیں اور علمائے بنی اسرائیل ان سے واقف ہیں۔ اگر یہ بدقسمت لوگ اس کو جھٹلاتے ہیں تو پیغمبر کو ان کی کوئی پروا نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنی ساری توجہ اپنے ایمان لانے والے ساتھیوں پر مرکوز کر دینی چاہیے۔ یہ شامت زدہ لوگ خود اپنا انجام بہت جلد دیکھ لیں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹۲-۲۲۷

وَاِنَّهٗ لَتَنۡزِيۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوۡحُ الۡاَمِيۡنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلۡبِكَ لِتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِيۡنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِىٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾ وَاِنَّهٗ لَفِىۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَلَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ اٰيَةً اَنۡ يَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۹۷﴾ وَلَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰى بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِيۡنَ ﴿۱۹۸﴾ فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۹﴾ كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِىۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۲۰۰﴾ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ

الْأَلِيمَ ﴿۲۰۱﴾ فَيَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۰۲﴾ فَيَقُولُوا هَلْ
نَحْنُ مُنْظَرُونَ ﴿۲۰۳﴾ أَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُونَ ﴿۲۰۴﴾ أَفَرَأَيْتَ إِنْ
مَتَّعْنَاهُمْ سِنِينَ ﴿۲۰۵﴾ ثُمَّ جَاءَهُمْ مَا كَانُوا يُوعَدُونَ ﴿۲۰۶﴾ مَا أَغْنَىٰ
عَنْهُمْ مَا كَانُوا يُمَتَّعُونَ ﴿۲۰۷﴾ وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا لَهَا
مُنْذِرُونَ ﴿۲۰۸﴾ ذِكْرَىٰ وَمَا كُنَّا ظَالِمِينَ ﴿۲۰۹﴾ وَمَا تَنَزَّلَتْ
بِهِ الشَّيَاطِينُ ﴿۲۱۰﴾ وَمَا يَنْبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ﴿۲۱۱﴾ إِنَّهُمْ
عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ﴿۲۱۲﴾ فَلَا تَدْعُ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَتَكُونَ
مِنَ الْمُعَذَّبِينَ ﴿۲۱۳﴾ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿۲۱۴﴾ وَاخْفِضْ
جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿۲۱۵﴾ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ
إِنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۲۱۶﴾ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ﴿۲۱۷﴾
الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ﴿۲۱۸﴾ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴿۲۱۹﴾
إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿۲۲۰﴾ هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَىٰ مَنْ تَنَزَّلُ
الشَّيَاطِينُ ﴿۲۲۱﴾ تَنَزَّلُ عَلَىٰ كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ﴿۲۲۲﴾ يُلْقُونَ السَّمْعَ
وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ ﴿۲۲۳﴾ وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ ﴿۲۲۴﴾ أَلَمْ
تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ ﴿۲۲۵﴾ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا
يَفْعَلُونَ ﴿۲۲۶﴾ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَكَرُوا اللَّهَ
كَثِيرًا وَانْتَصَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا ۗ وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ
ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ ﴿۲۲۷﴾

مع

ع ۱۱ ۳۶ ۱۵

ترجمۂ آیات ۱۹۲-۲۲۷

اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوندِ عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمہارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اُترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں۔ اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں؟ ۱۹۲-۱۹۷

اور اگر ہم اس کو کسی عجمی پر اتارتے اور وہ ان کو یہ سناتا تو وہ اس پر ایمان لانے والے نہ بنتے۔ ہم مجرموں کے دلوں میں اس کو اسی طرح داخل کرتے ہیں۔ یہ اس پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ پس وہ ان پر اچانک آدھمکے گا اور وہ اس سے باخبر نہ ہوں گے۔ اس وقت کہیں گے، کیا ہمیں کچھ مہلت ملے گی! ۱۹۸-۲۰۳

کیا وہ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں! بھلا بتاؤ تو کہ اگر ہم ان کو چند سال اور بہرہ مند رکھیں پھر ان پر وہ عذاب آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے تو یہ بہرہ مندی ان کے کس کام آئے گی! ۲۰۵-۲۰۷

ہم نے کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے پہلے ہوشیار کرنے والے بھیجے، یاد دہانی کے لیے اور ہم ظالم نہیں ہیں۔ ۲۰۸-۲۰۹

اور اس کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ نہ یہ ان کے لیے لائق ہے اور نہ یہ ان کے بس کا ہے۔ وہ سن گن لینے سے معزول کیے جا چکے ہیں۔ ۲۱۰-۲۱۲

پس تم اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہ پکارنا کہ تم بھی سزاوارِ عذاب ٹھہرو۔ اور اپنے قریبی خاندان والوں کو ڈراؤ اور جن اہلِ ایمان نے تمہاری پیروی کی ہے ان کے لیے اپنی شفقت کے بازو جھکائے رکھو۔ ۲۱۳-۲۱۵

اگر یہ لوگ تمھاری نافرمانی کر رہے ہیں تو ان کو سنا دو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو میں اس سے بری ہوں۔ اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو۔ اس خدا پر جو تمھیں دیکھتا ہے اس وقت جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے تمھاری آمد و شد کو سجدہ کرنے والوں کے درمیان۔ بیشک وہ سمیع و علیم ہے۔ ۲۱۶ - ۲۲۰

کیا میں تمھیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں! وہ پاپیوں بدکاروں پر اترتے ہیں جو کان لگاتے ہیں اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ۲۲۱ - ۲۲۳

اور شاعروں کی پیروی گمراہ کرتے ہیں۔ کیا نہیں دیکھتے کہ وہ ہر وادی میں بھٹکتے ہیں! اور وہ کہتے ہیں وہ جو کرتے نہیں۔ بس وہ اس سے مستثنیٰ ہیں جو ایمان لائے، جنھوں نے نیک اعمال کیے، جنھوں نے اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کیا اور جنھوں نے بدلہ لیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم ہوا۔ اور یہ جنھوں نے ظلم کیا ہے عنقریب جان لیں گے کہ ان کا ٹھکانا کیا ہوتا ہے۔ ۲۲۴ - ۲۲۷

۱۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَإِنَّهُ لَتَنْزِيلُ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ (۱۹۲-۱۹۴)

قرآن کا مرتبہ و مقام

'إِنَّهُ' میں ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ چونکہ اصل سیاق کلام، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، واضح ہے اس وجہ سے ضمیر مرجع کے بغیر آ گئی ہے۔

'تَنْزِيلٌ' کے معنی اہتمام کے ساتھ اتارنے کے ہیں۔ یہ قرآن کے منکرین و مخالفین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ یہ قرآن کاہنوں کے کلام کی طرح کوئی شیطانی القاء نہیں ہے بلکہ نہایت اہتمام سے اتارا ہوا اللہ رب العالمین کا کلام ہے اس وجہ سے اس کی قدر کریں۔ اس کی تکذیب کر کے اپنی شامت نہ بلائیں۔

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ۔ اَلرُّوحُ الْأَمِينُ حضرت جبریل علیہ السلام کا لقب ہے۔ اَمین کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حضرت جبریلؑ کے حوالہ کیا وہ بے کم و کاست

بغیر کسی ادنیٰ تغیر و تبدل کے، انھوں نے پیغمبر کو پہنچایا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی خیانت نہیں کی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اسلام دشمنی کے جوش میں یہود اور روافض نے حضرت جبریلؑ پر نعوذ باللہ خیانت کا الزام بھی لگایا ہے۔ بقرہ کی تفسیر میں اس کی طرف ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

'عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ'۔ ضمیر کا مرجع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یعنی اس وحی کا مہبط تمھارا نفس نہیں بلکہ قلب ہے جو انسان کے وجود کا سب سے اشرف و اعلیٰ حصہ ہے اس وجہ سے اس شبہے کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس میں کسی نفسانی وسوسہ یا شیطانی وغدغہ کو کوئی دخل ہو۔ اگرچہ آیت میں خطاب ظاہر الفاظ کے اعتبار سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ لیکن کلام کا مقصود مخالفین پر اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ یہ کلام، پاک منبع سے نکلا ہے، پاک ذریعہ سے اترا ہے اور پاک ترین محل میں اس نے اپنا مستقر بنایا ہے۔

'لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ' یہ اس کلام کے اس اہتمام و شان کے ساتھ اتارے جانے کا مقصد بیان ہوا ہے کہ یہ اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سے تم ان لوگوں کو، جو خدا اور آخرت سے بالکل بے پروا ہو کر زندگی بسر کر رہے ہیں اس غفلت کے نتائج و عواقب سے اچھی طرح آگاہ کر دو۔ یعنی یہ کلام محض کلام نہیں ہے بلکہ یہ انذار ہے اور تم ایک منذر ہو اس وجہ سے لوگ اس کو گوشِ ہوش سے سنیں ورنہ ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہیں جن کی یہ خبر دے رہا ہے۔

بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ (۱۹۵)

اہل عرب کو تنبیہ

یہ اہل عرب پر اظہار احسان ہے کہ اللہ نے یہ تم پر خاص فضل فرمایا ہے کہ اس نے اس کلام کو نہایت واضح عربی زبان میں اتارا ہے۔ یہ چیز تمھارے لیے باعث شرف بھی ہے اور اس میں تمھارے اوپر اتمام حجت بھی ہے۔ اب تم یہ عذر نہیں کر سکتے کہ تم اس کے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کی ذمہ داری تمھارے ہی اوپر ہو گی۔

وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ٥ اَوَلَمْ یَکُنْ لَّهُمْ اٰیَةً اَنْ یَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (۱۹۶-۱۹۷)

قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت

یہ قرآن کے حق میں سابق صحیفوں کی شہادت کا حوالہ ہے کہ اس کا ذکر اور اس کی پیشین گوئی انبیائے سابقین کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم و دعوت سے متعلق تورات، زبور اور انجیل میں جو پیشین گوئیاں ہیں ہم ان کا حوالہ ان کے محل میں دے چکے ہیں۔ ان پیشین گوئیوں سے بنی اسرائیل کے علماء اچھی طرح آگاہ تھے۔ اگرچہ ان کی اکثریت نے ان کو چھپایا لیکن ان کے اندر ایسے علمائے حق بھی تھے جنھوں نے ان کا برملا اظہار کیا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی لائے۔ قرآن نے ان کی اس حق پرستی کی جگہ جگہ نہایت شاندار الفاظ میں تعریف فرمائی ہے۔

انھی پیشین گوئیوں اور انھی علماء کا حوالہ دے کر یہ قرآن کے مخالفین سے سوال کیا ہے کہ کیا قرآن اور

اس کے داعی کی صداقت کی یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ وہ کسی مزید نشانی کا مطالبہ کر رہے ہیں؟ یہ امر ملحوظ رہے کہ دینی معاملات میں اہل عرب اہل کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے جوش میں وہ ایسے اندھے ہو گئے کہ جن اہل کتاب نے ان کی پیٹھ ٹھونکی ان کو تو انھوں نے اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھا لیکن جنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید کی ان کو انھوں نے، جیسا کہ پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے، قرآن کی تصنیف میں شریک سازش قرار دے دیا۔

ترجمۂ قرآن کا قائم مقام نہیں

آیت وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ کی یہ تاویل جو ہم نے کی ہے نہایت واضح ہے۔ اس کے شواہد پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکے ہیں، آگے بھی آئیں گے لیکن معلوم نہیں کہ کس طرح بعض فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ انھوں نے اس سے یہ استنباط کیا ہے کہ قرآن کسی عجمی زبان میں بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کسی دوسری زبان میں اگر قرآن کو منتقل کیا جائے گا تو وہ قرآن نہیں ہوگا بلکہ اس کا ترجمہ ہوگا اور ترجمہ اور اصل میں آسمان و زمین کا فرق ہوتا ہے۔ پورے قرآن کو تو درکنار قرآن کی کسی ایک سورہ بلکہ ایک آیت کے ترجمہ کو قرآن کی سورہ یا اس کی آیت کا قائم مقام نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جو لوگ قرآن کے ایجاز اور اس کے اعجاز سے واقف ہیں ان کا تجربہ تو یہ ہے کہ بعض آیات کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے۔ مترجم ان میں کوئی ابہام یا اشکال بھی محسوس نہیں کرتا، لیکن برسوں کی محنت کے بعد بھی جب وہ ان کا ترجمہ کرنے بیٹھتا ہے تو، ترجمہ کی زبان پر پوری قدرت رکھنے کے باوجود، وہ صاف محسوس کرتا ہے کہ ترجمہ میں آیت کی بلاغت تو درکنار اس کے پورے مفہوم کو بھی وہ ادا نہیں کر پایا۔ قرآن تو خیر ایک معجز کتاب ہے، دوسرے آسمانی صحائف، جن کے معجز ہونے کا دعویٰ نہیں کیا گیا ہے، ان کا حال بھی یہ ہے کہ ان کے ترجموں کو ان کی اصل کا قائم مقام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ بلکہ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں بڑا دخل اس چیز کو بھی ہے کہ ان کے صحیفوں کی اصل زبان مٹ گئی اور انھوں نے ان کے ترجموں ہی کو اصل کا قائم مقام قرار دے کر انہی پر اپنی تمام فقہ اور سارے علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔ پال نے نصاریٰ کو گمراہ کرنے میں انجیلوں کے ترجموں سے جو کام لیا ہے اس کی وضاحت ہم اس کے محل میں کر چکے ہیں۔ بہرحال ہمارے نزدیک یہ استنباط اس آیت سے بالکل بے جوڑ اور بجائے خود بالکل غلط بلکہ دین کے لیے ایک شدید فتنہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جن فقہاء کی طرف یہ بات منسوب کی گئی ہے کسی غلط فہمی کی بنا پر منسوب کی گئی ہے لیکن یہ بحث ہمارے موضوع سے الگ ہے اس وجہ سے ہم اس کی تحقیق میں پڑنا نہیں چاہتے۔

وَلَوْ نَزَّلْنٰهُ عَلٰی بَعْضِ الْاَعْجَمِیْنَ ۝ فَقَرَاَهٗ عَلَیْهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ مُؤْمِنِیْنَ (۱۹۸-۱۹۹)

یہ اسی امتنان و احسان کے مضمون کی، جو آیت ۱۹۲ میں گزرا، مزید وضاحت فرمائی کہ اگر یہ قرآن کسی عجمی پر عجمی زبان میں اترا ہوتا اور وہ ان کو سناتا تب تو وہ یہ عذر کرتے کہ عربی کے لیے عجمی قرآن کے کیا

معنی! لیکن اب وہ کیا عذر پیش کریں گے جب کہ اللہ نے انہی کی بہترین زبان میں اور انہی کے بہترین شخص پر اس کلام کو نازل فرمایا! سورہ حٰم السجدہ میں یہ مضمون یوں بیان ہوا ہے: وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ (۴۴) (اور اگر ہم اس کو عجمی قرآن بناتے تو یہ کہتے کہ اس کی آیات کھولی کیوں نہ گئیں! کلام عجمی اور مخاطب عربی) سورۂ نحل کی آیت ۱۰۳ میں بھی اس مضمون کے ایک پہلو کی وضاحت ہوئی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كَذٰلِكَ سَلَكْنٰهُ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ٥ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ٥ فَيَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ٥ فَيَقُوْلُوْا هَلْ نَحْنُ مُنْظَرُوْنَ (۲۰۰-۲۰۳)

'سَلَكَ' کے معنی کسی چیز کو کسی چیز کے اندر داخل کرنے کے بھی آتے ہیں۔ یہاں یہ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

مخالفینِ قرآن کی اصل بیماری

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ یہ لوگ قرآن سے جو بدک رہے ہیں اس کا سبب قرآن کی کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ ان کے دلوں کی خرابی ہے۔ مسلسل مجرمانہ زندگی بسر کرنے کے سبب سے ان کے دل اس قدر فاسد ہو چکے ہیں کہ ان کے اندر اب کوئی صحیح چیز قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔ ایک غلط روش پر پختہ ہو جانے کے باعث ان کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے قرآن کی سیدھی باتیں ان کے دلوں کو چیرتی ہوئی داخل ہوتی ہیں اور ان کی طبیعتیں اس کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہیں۔ جس کا معدہ فاسد ہو چکا ہو اس کو صالح سے صالح غذا بھی دیجیے تو اس کی طبیعت اس کو قبول نہیں کرتی بلکہ وہ قے کر دیتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہو چکا ہے اور یہ بات سنتِ الٰہی کے تحت ہوئی ہے۔ اس لیے کہ جو لوگ اپنی فطرت مسخ کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے۔ اب یہ لوگ قرآن کی صداقت اسی وقت تسلیم کریں گے جب اس عذاب کو دیکھ لیں گے جس کی قرآن ان کو خبر دے رہا ہے۔ وہ عذاب ان پر اچانک آئے گا۔ اس کے ظہور سے پہلے ان کو اس کی کوئی خبر بھی نہ ہو گی۔ اس وقت وہ نہایت حسرت کے ساتھ کہیں گے کہ کیا ہمیں کچھ تھوڑی سی مہلت اور ملے گی کہ ہم اپنے رویے کی اصلاح کر لیں لیکن اس کا وقت گزر چکا ہو گا۔

اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ٥ اَفَرَءَيْتَ اِنْ مَّتَّعْنٰهُمْ سِنِيْنَ ٥ ثُمَّ جَآءَهُمْ مَّا كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ٥ مَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يُمَتَّعُوْنَ (۲۰۴-۲۰۷)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب

سوال اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں حالانکہ جو چیز شدنی ہے وہ بہرحال شدنی ہے۔ اگر اس میں کچھ دیر ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب یہ اس سے مامون ہو گئے۔ اگر ہم نے ان کو چند سال اور کھانے پینے کی مہلت دے دی تو اس سے کیا فرق پیدا ہو جائے گا بالآخر تو ان کو اسی چیز سے سابقہ پیش آنا ہے جس سے ان کو آگاہ کیا جا

رہا ہے: ان کے اندر رسول کی بعثت نے اب یہ فیصلہ کن مرحلہ ان کے سامنے کر دیا ہے۔ اس میں اگر تاخیر ہو رہی ہے تو یہ مصلحتِ الٰہی سے ہو رہی ہے۔ اس تاخیر کے سبب سے اگر یہ اس سے نچنت ہو کر اس کا غذاق اڑا رہے ہیں تو یہ ان کی بدبختی ہے۔

وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا لَهَا مُنْذِرُوْنَ ۝ ذِكْرٰى ۛ وَمَا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ (۲۰۸-۲۰۹)

قریش کو تنبیہ

یہ اس سنتِ الٰہی کی یاد دہانی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قوموں کے معاملے میں اختیار فرمائی ہے کہ وہ عادل اور رحیم ہے اس وجہ سے انذار اور اتمامِ حجت کے بغیر وہ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ ذِكْرٰى یہاں رسولوں کے مقصدِ بعثت کی وضاحت کے لیے ہے اور اسلوبِ بیان واضح کر رہا ہے کہ مقصود اس پر خاص طور پر زور دینا ہے کہ بغیر اس یاد دہانی کے اللہ تعالیٰ کسی قوم کو ہلاک نہیں کرتا۔ بغیر یاد دہانی کے ہلاک کرنا ظلم ہوتا اور اللہ تعالیٰ ظالم نہیں ہے۔ یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ سنتِ الٰہی کے مطابق تذکیر کے لیے ایک منذر آگیا ہے۔ اگر تم نے اس کی قدر نہ کی تو اس کا جو لازمی نتیجہ ہے وہ تمہارے سامنے آکر رہے گا۔ اور یہ کوئی ظلم نہیں ہوگا بلکہ عین عدل ہوگا۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ (۲۱۰)

مخالفینِ قرآن کے اوہام کی تردید

اوپر آیت ۱۹۲ میں جو بات مثبت پہلو سے فرمائی ہے وہی بات یہاں منفی پہلو سے ارشاد ہوئی ہے۔ ان مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا کلام ہے۔ شیاطین کا اتارا ہوا نہیں ہے جیسا کہ تم (یعنی قریش) سمجھتے یا کہتے ہو۔

وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ (۲۱۱-۲۱۲)

یہ دلیل ارشاد ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ شیطانی کلام نہیں ہو سکتا۔

اس بات کے دلائل کہ قرآن کیوں شیطانی کلام نہیں ہو سکتا۔

پہلی دلیل اس کی یہ ہے کہ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ یعنی اس طرح کا کلام اتارنا شیاطین کے لائق کام نہیں ہے اس لیے کہ یہ شیاطین کے مقصد اور ان کے مشن کے بالکل خلاف ہے۔ یہ کلام اتار کر آخر اپنے ہی ہاتھوں وہ اپنی سلطنت برباد کیوں کریں گے۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے جواب میں فرمائی تھی جب انھوں نے آپ کے معجزات کے اثر کو مٹانے کے لیے عوام میں یہ پھیلانا شروع کیا کہ یہ بدروحوں کو لوگوں کے اندر سے نکالنے کا جو کرشمہ دکھاتے ہیں یہ بعلزبول کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ ان کے جواب میں سیدنا مسیحؑ نے جو کچھ فرمایا وہ انجیل میں یوں نقل ہوا ہے۔

"لیکن ان میں سے (اشارہ فقیہوں اور فریسیوں کی طرف ہے) بعض نے کہا یہ تو بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہے...... مگر اس نے (حضرت مسیحؑ نے) ان کے خیالات کو جان کر ان سے کہا جس سلطنت میں پھوٹ پڑے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس گھر میں پھوٹ

پڑے وہ برباد ہو جاتا ہے۔ اور اگر شیطان بھی اپنا مخالف ہو جائے تو اس کی سلطنت کس طرح قائم رہے گی؟ لوقا: باب ۱۱-۱۶-۱۸

بعینہٖ یہی بات قرآن نے مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَهُمۡ کے دو لفظوں میں فرما دی ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ وَمَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ وہ اس طرح کا کلام نازل کر بھی نہیں سکتے۔ قرآن نے قریش کو یہ تحدی بار بار کی کہ اگر تم اس کلام کو انسانی کلام سمجھتے ہو تو اس کے مانند کوئی کلام اپنے شریکوں شاعروں، کاہنوں اور جنوں کی مدد سے پیش کرو۔ لیکن وہ اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ کلام جنات و شیاطین کے بس کا کام نہیں ہے۔ اگر ان کے بس کا ہوتا تو ان کے ساتھ سب سے زیادہ گہری دوستی تو قریش اور اس کے کاہنوں کی تھی۔ آخر انھوں نے ان کی مدد کیوں نہیں کی!

تیسرا جواب یہ دیا ہے کہ اِنَّهُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ یعنی ان کو ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ یہ ملأ اعلیٰ کی باتوں کی کچھ سن گن لے لیتے ہیں تو یہ محض واہمہ ہے۔ اب تک اگر یہ کچھ کان لگانے اور ٹوہ لینے کی کوشش کرتے بھی رہے ہیں تو اب اس سے بھی روک دیے گئے ہیں۔ سورۂ جن میں خود جنات کی زبان سے ان کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے۔

وَاَنَّا لَمَسۡنَا السَّمَآءَ فَوَجَدۡنٰهَا مُلِئَتۡ حَرَسًا شَدِيۡدًا وَّشُهُبًا ۙ وَّاَنَّا كُنَّا نَقۡعُدُ مِنۡهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمۡعِ ؕ فَمَنۡ يَّسۡتَمِعِ الۡاٰنَ يَجِدۡ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۙ (الجن: ۸-۹)	اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ اس کو مضبوط پہرے اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس میں مختلف ٹھکانوں میں کچھ سننے کے لیے بیٹھتے تھے لیکن اب جو کوئی کان لگائے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

سورۂ جن کی یہ آیت نظامِ ملکوت میں ایک اہم انتظام کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کو ہر قسم کی شیطانی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان شاء اللہ سورہ کی تفسیر میں ہم اس کی وضاحت کریں گے۔

فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِيۡنَ (۲۱۳)

چند آیات التفات — یہ اور آگے کی چند آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ خطاب اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو عتاب ہے اس کا رخ مکذبین و منکرین کی طرف ہے۔ فرمایا کہ اصل حقیقت یہ ہے جو تم پر ظاہر کر دی گئی ہے تو تم بہرحال اللہ واحد کے ساتھ کسی اور معبود کو شریک نہ کرو بلکہ ان لوگوں کی تمام مخالفت کے علی الرغم اپنے موقفِ حق پر جمے رہو کہ اس عذاب سے محفوظ رہو جو ان مکذبین پر آیا چاہتا ہے۔

قریبی خاندان کو انذار کا حکم — وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ۙ وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (۲۱۴-۲۱۵)

یعنی اس عذاب سے جس کی خبر دی جا رہی ہے، اپنے اہل خاندان کو ہوشیار کر دو۔ یہ تمھارے

عزیزواقارب ہیں اس وجہ سے تمھاری خیرخواہی کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی خاندان ہی تھا جس کو بیت اللہ کی تولیت اور اہل عرب کی دینی وسیاسی پیشوائی کا منصب حاصل تھا اس وجہ سے قرابت اور سیاست دونوں کا تقاضا یہ تھا کہ آپؐ ان کو آنے والے خطرے سے آگاہ کردیں۔ اگر وہ اصلاح قبول کرلیتے تو دوسروں کی اصلاح کا معاملہ بہت آسان ہوجاتا۔ اسی وجہ سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ہمیشہ یہ سنت رہی ہے کہ انھوں نے اپنے زمانہ کے قائدین کو انذار کیا ہے۔ عوام کی طرف اس وقت توجہ فرمائی ہے جب قائدین نے اپنے رویہ سے مایوس کردیا ہے۔ سیدنا مسیح علیہ السلام نے پہلے سارا زور یہود کے علماء پر صرف فرمایا لیکن جب وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے تو انھوں نے عوام کی طرف توجہ فرمائی۔ اسی پہلو سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپؐ کے عشیرۂ اقربین کے انذار کی ہدایت ہوئی کہ قرابت کا حق بھی ادا ہوجائے اور اگر وہ اصلاح قبول کرلیں تو آگے کے لیے دعوت کی راہ بھی صاف ہوجائے۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ جو لوگ ایمان لاچکے تھے ان کے معاملے میں آپ کو یہ ہدایت ہوئی کہ جس طرح کسی خطرے کو محسوس کرکے مرغی اپنے بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپائے رکھتی ہے اسی طرح تم ان لوگوں کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے چھپائے رکھو کہ ان میں سے کوئی غفلت کے سبب سے اس عذاب کی زد میں نہ آجائے جس کی خبر دی جارہی ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آپؐ پر ایمان لانے والوں میں اس عشیرۂ اقربین کے بہت کم افراد شامل تھے جن کے اوپر انذار کی ہدایت ہوئی ہے بلکہ یہ زیادہ تر عوام کے طبقہ کے غریب و نادار لوگ تھے جن کو قریش کے اکابر نہایت حقیر سمجھتے تھے لیکن ان کے لیے اس شفقت ورحمت کی ہدایت ہوئی اور اُن کے لیے اُس انذار کی۔

فَاِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ (۲۱۶)

یعنی اگر تمھارے عشیرۂ اقربین کے لوگ تمھارے انذار کو خاطر میں نہ لائیں تو تم ان سے صاف الفاظ میں اعلانِ برأت کردو کہ جو کچھ تم لوگ کررہے ہو میں اس کی ذمہ داری سے بری ہوں ہم دوسرے مقام میں یہ واضح کرچکے ہیں کہ یہ اعلانِ برأت انذار کا آخری مرحلہ ہے۔ اس کے بعد رسول کے مکذبین کے لیے عذاب اور رسول اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کا مرحلہ آجاتا ہے۔ یہ اعلانِ برأت تمام انبیاء علیہم السلام سے منقول ہے۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے جس طرح اعلانِ برأت کیا وہ پیچھے گزر چکا ہے۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ (۲۱۷)

یعنی اس اعلانِ برأت کے نتائج کی پروا نہ کرو بلکہ اپنے رب عزیز ورحیم پر پورا بھروسہ رکھو کہ وہ آگے کے مراحل میں، ہر مشکل اور ہر خطرے میں، تمھاری اور تمھارے ساتھیوں کی مدد فرمائے گا۔

وہ عزیز ہے، اس وجہ سے جو کچھ وہ کرنا چاہے گا کر ڈالے گا۔ کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور رحیم ہے اس وجہ سے وہ اپنے ان بندوں کو اپنی رحمت سے نوازے گا جو اس کی خاطر اپنے عزیزوں قریبیوں کو چھوڑیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس اعلانِ برأت کے بعد پیغمبر اور اس کے ساتھی اپنے ماحول سے کٹ کر ایک نئے ماحول سے جڑتے ہیں اور یہ نیا ماحول بالکل پردۂ خفا میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ اپنوں کو دشمن بنا لینا درآنحالیکہ مستقبل بالکل مجہول ہو کوئی آسان بازی نہیں ہے۔ یہ بازی وہی لوگ کھیل سکتے ہیں جن کو اپنے رب پر پورا بھروسہ ہو کہ وہ عزیز بھی ہے اور رحیم بھی۔

الَّذِیْ یَرٰىکَ حِیْنَ تَقُوْمُ ۙ وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۲۱۸-۲۲۰)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ کی شب خیزی، فکر مندی اور طلب رضائے الٰہی میں سرگرمی و مستعدی کی نہایت شاندار و دل نواز انداز میں تعریف و تحسین ہے کہ اپنے اس رب پر پورا بھروسہ رکھو جو تمہیں اس وقت دیکھتا ہے جب تم شب میں تہجد کے لیے اٹھتے ہو، اور اس سے دعا و مناجات کرتے ہو اور یہ کوشش بھی کرتے ہو کہ تمہارے دوسرے ساتھی بھی اس شب خیزی و دعا و مناجات کی برکتوں اور سعادتوں سے بہرہ مند ہوں۔ تمہاری یہ ساری سرگرمیاں تمہارے رب کے علم میں ہیں۔ وہ سمیع و علیم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اس کے علم میں ہیں تو یہ ضائع جانے والی نہیں۔ تمہارا رب عزیز و رحیم ہر مشکل میں تمہاری مدد فرمائے گا۔

'حِیْنَ تَقُوْمُ' کی تاویل

'حِیْنَ تَقُوْمُ' کی تاویل میں مفسرین سے مختلف اقوال منقول ہیں اور ان میں سے ہر قول کی صحت کا احتمال ہے لیکن 'تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ' کے قرینہ کی بنا پر میں زیادہ قوی ان لوگوں کے قول کو سمجھتا ہوں جنھوں نے اس سے قیامِ لیل کو مراد لیا ہے۔ ہم یہ بات مختلف مقامات پر بدلائل واضح کر چکے ہیں کہ دعوت کے مراحل جتنے ہی سخت ہوتے گئے ہیں قدرتی طور پر اتنی ہی آپ کی شب بیداری میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے تاکید میں بھی اضافہ ہوتا گیا ہے۔ آخری گروپ کی سورتوں میں اس کی تفصیلات ان شاء اللہ آئیں گی۔ یہاں آپ کی انہی سرگرمیوں کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری شب بیداریوں کو خدا دیکھ رہا ہے۔ یہ چیز ضائع جانے والی نہیں ہے۔ یہ مضمون سورۂ طور کی آیت ۴۸ اور سورۂ ق کی آیت ۳۹ میں بھی آئے گا۔ وہاں ہم ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت کریں گے۔

'وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیْنَ'۔ 'تَقَلُّب' کے معنی آمد و شد اور ایاب و ذہاب کے ہیں۔

نبیؐ اور صحابہؓ کی شب خیزی کی تحسین

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح خود شب کی دعا و مناجات کا اہتمام فرماتے تھے۔ اسی طرح اپنے صحابہ کو بھی اس کی تاکید فرماتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپ مسجد میں جا کر یہ روح پرور منظر دیکھتے بھی تھے کہ لوگ دعا و عبادت میں مشغول ہیں۔ اوپر آیت ۲۱۵ میں آپ کو مومنین کے باب میں یہ ہدایت جو فرمائی گئی کہ ان کو اپنی شفقت کے بازوؤں کے نیچے رکھو، یہ بھی اسی کا ایک پہلو ہے کہ آپ کی طرح آپ کے ساتھی بھی پوری طرح چوکنے اور بیدار رہیں۔ انجیلوں میں سیدنا مسیحؑ کے بارے میں بھی آتا ہے کہ جب

آزمائش کا آخری مرحلہ آیا ہے تو وہ ایک پہاڑی پر جا کر دعا میں مشغول ہو گئے اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت فرمائی کہ وہ جاگیں اور دعا کریں کہ فتنہ میں نہ پڑیں۔ پھر وہ بار بار اپنے شاگردوں کے پاس یہ دیکھنے کے لیے آئے کہ وہ دعا کر رہے ہیں یا نہیں۔ شاگرد سو جاتے تو وہ ان کو بار بار جگاتے کہ دعا کرو تاکہ فتنہ سے محفوظ رہو۔

اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ اوپر توکل کی ہدایت کے ساتھ اپنی صفات عزیز و رحیم کا حوالہ دیا ہے اب یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی شب بیداریوں کا حوالہ دینے کے بعد اپنی صفات سمیع و علیم کا حوالہ دیا ـــــ موقع و محل بالکل واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ کی انہی صفات کے استحضار پر توکل کی بنیاد ہے۔

هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ (۲۲۱-۲۲۳)

شیاطین کن پر اترتے ہیں؟

اوپر کی آیات میں آپ نے دیکھا کہ پوری وضاحت کے ساتھ قرآن کے منبع و مصدر، اس کے مامون و محفوظ واسطۂ نزول اور اس کے پاک و مطہر حامل کا ذکر ہوا ہے اور اس بات کی تردید کی گئی ہے کہ یہ کوئی القائے شیطانی ہے۔ یہ ساری باتیں قرآن کے ان مخالفین کی تردید میں فرمائی گئی ہیں جو نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ آپ ایک کاہن ہیں اور جس طرح کاہنوں پر شیاطین غیب کی باتیں القا کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی شیاطین یہ کلام القا کرتے ہیں جس کو یہ ہمارے سامنے وحی الٰہی کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اب یہ خلاصۂ بحث کے طور پر ان الزام لگانے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا اگر تم فی الواقع یہ جاننا چاہتے ہو کہ شیاطین کن پر اترتے ہیں تو آؤ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ یہ کن پر اترتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ان لپاٹیوں اور نابکاروں پر اترتے ہیں جو ان کی طرف کان لگاتے ہیں اور ان میں اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ان کاہنوں کی تصویر ہے جن کے دام فریب میں مشرکین عرب پھنسے ہوئے تھے۔ ان صفات کے ساتھ ان کا ذکر کر کے، ان کا پورا کردار سامنے کر دیا ہے۔ ان کی پہلی صفت یہ بتائی ہے کہ یہ 'اَفَّاكٍ' یعنی بالکل لاغی، دروغ باف اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ یہ سادہ لوحوں کو بیوقوف بنانے کے لیے طرح طرح کے جھوٹ گھڑتے ہیں اور پھر اس دعوے کے ساتھ ان کو پیش کرتے ہیں کہ یہ باتیں ان پر غیب سے القا ہوئی ہیں۔ ان کی دوسری صفت 'اَثِيْمٍ' بیان ہوئی ہے یعنی اخلاقی اعتبار سے یہ ہر قسم کے گناہوں میں آلودہ ہیں۔ آخر میں ان کے اس ڈھونگ کی تصویر پیش کی گئی ہے جو عوام کو بیوقوف بنانے کے لیے یہ لوگ اختیار کرتے تھے۔ ان لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ احمق لوگ جب کسی معاملے میں غیب کی باتیں معلوم کرنے کے لیے ان سے رجوع کرتے تو یہ لوگ کچھ عملیاتِ سفلیہ کے ساتھ مراقبہ کرتے اور پھر ایک مقفّیٰ کلام کی صورت میں (جو اکثر بالکل بے معنی یا ذو معانی ہوتا) اپنا الہام پیش کرتے کہ یہ ان پر غیب سے فلاں جن نے القا کیا ہے۔ ان کے اس مراقبہ کو یہاں 'القائے سمع' سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ وہ مراقبہ میں اس طرح بیٹھتے گویا ہاتف غیب سے کوئی بات سننے کے لیے کان لگائے ہوتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ

ہے کہ مراقبہ کا یہ طریقہ تمام مشرک قوموں میں رہا ہے۔ کاہن، پروہت، جوگی، عامل، متصوفین اور قبروں کے مجاورین اسی طرح کی نمائش کر کے ارواحِ غیب سے رابطہ پیدا کرنے کا دعویٰ کرتے اور لوگوں کو بیوقوف بناتے رہے ہیں۔

کہانت کے جھوٹے دعوے

وَاَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ۔ کاہنوں میں بعض بعض تو عملیات سفلیہ کے جاننے والے ہوتے اور ان کے ذریعہ سے وہ بعض جنات سے تعلق پیدا کر لیتے تھے جو ان پر جھوٹ سچ کچھ القا بھی کرتے تھے لیکن اکثر کاہن محض اس پیشہ کو عوام فریبی کا ایک کامیاب پیشہ سمجھ کر کاہن ہونے کے مدعی بن جاتے اور لوگوں کو اُلّو بناتے پھرتے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ان میں سے اکثر اپنے اس باطل پیشۂ کہانت میں بھی سچے نہیں ہیں بلکہ جھوٹے ہیں۔ اگر ایک شخص ساحر ہو اور وہ اپنے کو ساحر کی حیثیت سے پیش کرے تو گو سحر و ساحری ایک باطل شے ہے لیکن وہ اپنے دعوے میں سچا ہے لیکن ایک شخص ساحر نہ ہو اور ساحر ہونے کی نمائش کرے تو وہ لپاٹیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۝ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اَیَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۴-۲۲۷)

آنحضرتؐ پر شاعر ہونے کے الزام کی تردید

اوپر کی آیات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کے الزام کی تردید ہوئی۔ اب آگے کی آیات میں شعر و شاعری کے الزام کی تردید آ رہی ہے۔ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر یا قرآن کو جو شعر کہتے تھے تو شعر یا شاعری کے معروف معنی میں نہیں کہتے تھے۔ آخر وہ ایسا کہہ بھی کیسے سکتے تھے! معروف معنی میں نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے کی کوئی وجہ تھی اور نہ قرآن کو شعر کہنے کی۔ اصل یہ ہے کہ جب قریش نے دیکھا کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت دلوں کو مفتوح کرتی جا رہی ہے اور اس طرح اس کے خدائی کتاب ہونے کا دعویٰ روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا ہے تو اس کے توڑ کے لیے انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ قرآن میں جو بلاغت و جزالت ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ کوئی آسمانی کلام ہے بلکہ جس طرح ہمارے بڑے بڑے شاعروں کے کلام میں بلاغت ہوتی ہے اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کلام میں بھی بڑی بلاغت ہے جو دلوں کو مسحور کرتی ہے۔ مطلب یہ کہ ان کو اگر رکھو تو اپنے بلند رتبہ شاعروں ہی کے درجے میں رکھو، ان کو خدا کا رسول اور ان کے کلام کو وحی الٰہی کا درجہ و مرتبہ دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس کے اندر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اہل عرب یہ تصور رکھتے تھے کہ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ایک جن ہوتا ہے جو اس کو شعر الہام کرتا ہے۔ یہ تصور دے کر وہ لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر خدا کی طرف سے ایک فرشتہ یہ کلام لے کر اترتا ہے محض واہمہ ہے۔ یہ فرشتہ نہیں بلکہ اسی طرح کا کوئی جن ہے جس طرح کا جن ہر بڑے شاعر کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔

الزام لگانے والوں کے اس ذہنی پس منظر کو سامنے رکھ کر اب قرآن کے جواب پر غور کیجیے۔ قرآن نے یہاں تین کسوٹیاں معترضین کے سامنے رکھ دی ہیں کہ ان پر پرکھ کر وہ فیصلہ کرسکتے ہیں کہ یہ کلام شعر اور اس کا پیش کرنے والا کوئی شاعر ہے یا یہ کلام، کلام ربانی اور اس کا سنانے والا اللہ کا رسول ہے۔

فیصلے کے لیے تین کسوٹیاں

پہلی کسوٹی: درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُنَ (۲۲۴) پہلی کسوٹی یہ ہے کہ درخت اپنے پھل اور آدمی اپنے ساتھیوں سے پہچانا جاتا ہے۔ تم اپنے شاعروں کو دیکھو کہ ان کے کلام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور ان کو متاثر کیا ہے اور پھر پیغمبرؐ کو دیکھو کہ ان کے کلام و پیغام نے کس طرح کے لوگوں کو اپنی طرف جذب کیا ہے؟ اگر انصاف سے دیکھو تو صاف نظر آئے گا کہ ان شعراء کے ساتھی گمراہ، اوباش، عیاش اور شر پسند قسم کے لوگ بنے ہیں اور اس کے بالکل برعکس پیغمبرؐ کے کلام نے ان لوگوں کو متاثر کیا ہے جو شریف نیک طینت، صالح فطرت اور خدا ترس ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عرب کی سوسائٹی میں شاعری کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ عوام کی باگ بالکل انہی کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ یہ جو آگ بھڑکا دیتے ان کے پیرو عوام نتائج سے بے پروا ہو کر، بے خطر اس میں کود پڑتے۔ بکر و تغلب کی مشہور لڑائی، جس کے متعلق مشہور ہے کہ نصف صدی تک جاری رہی، اس کی آگ بھڑکانے میں سب سے زیادہ دخل مشہور شاعر مہلہل کے اشعار کو تھا۔ اخلاقی اعتبار سے اس شاعری کا جو حال تھا اس کا اندازہ ان کے سب سے بڑے شاعر امرءالقیس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کے بڑے شاعروں میں اس کی فحاشی کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہاں تک کہ اہل عرب بھی، اس کو اپنا سب سے بڑا شاعر ماننے کے باوجود اس کو 'الملک الضلیل' (رند بادشاہ) کہتے تھے۔ اس کی شاعری میں اگر مکارمِ اخلاق کی باتیں ملتی ہیں تو وہ بطور مفاخر کے ملتی ہیں اور ان کے ساتھ بھی ایسے گھنونے مفاسد چپکے ہوئے تھے کہ ان کا ضرر ان کے نفع پر غالب ہو گیا تھا۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں جوئے اور شراب کی بحث میں ہم اس مسئلہ پر لکھ آئے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ظاہر ہے کہ جو شاعر اس مزاج اور اس قماش کے ہوں گے وہ اسی قسم کے لوگوں کو اپنے ارد گرد جمع کر سکیں گے جو ان کے ہم مشرب اور ہم رنگ ہوں۔

دوسری کسوٹی: شاعروں کا کوئی معین ہدف نہیں ہوتا

أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ (۲۲۵) یہ دوسری کسوٹی ہے کہ ان شاعروں کی شاعری کا کوئی معین ہدف نہیں۔ جو وارد ہ دل پر گزر گیا، اگر اس کو ادا کرنے کے لیے ان کو کوئی اچھوتا اسلوب ہاتھ آگیا تو اس کو شعر کے قالب میں ڈھال دیں گے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رحمانی ہے یا شیطانی، روحانی ہے یا نفسانی، اس سے خیر کی تحریک ہوگی یا شر کی۔ ان کے اشعار پڑھیے تو ایک شعر سے معلوم ہوگا کہ ولی ہیں، دوسرے شعر سے معلوم ہوگا کہ شیطان ہیں۔ ایک ہی سانس میں وہ نیکی اور بدی دونوں کی باتیں بے تکلف کہتے ہیں اور چونکہ اچھوتے اور مؤثر اسلوب سے کہتے ہیں اس وجہ سے پڑھنے والے دونوں

سے متاثر تو ہوتے ہیں لیکن نفس کو زیادہ مرغوب چونکہ بدی کی باتیں ہیں اس وجہ سے اس کے نقوش تو دلوں پر قائم رہ جاتے ہیں، نیکی کا اثر غائب ہوجاتا ہے اور اس طرح اگر ان کے کلام میں کچھ افادیت ہوتی بھی ہے تو وہ ان کے تضادِ فکر میں غائب ہوجاتی ہے ۔ جھاڑ جھنکاڑ کے جنگل میں اگر کچھ صالح پودے بھی لگادیے جائیں تو وہ مثمر نہیں ہوتے۔

اس کے بالکل برعکس قرآن کی ہم آہنگی و ہم رنگی کا حال یہ ہے کہ اس کا مخصوص و معین ہدف ہے اور شروع سے لے کر آخر تک اس کی ہر آیت اسی ہدف پر پہنچتی ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ اس کے اندر کوئی کسی تضاد و تناقض کی نشان دہی کر سکے اور قرآن نے اپنے اس معین ہدف کی صداقت ایسے مضبوط دلائل سے ثابت کر دی ہے کہ ایک ہٹ دھرم کے سوا کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے کلام کو شعر اور اس کے پیش کرنے والوں کو شاعر کہنے کا کیا تک ہے!

تیسری کسوٹی، شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں

وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ (۲۲۶) یہ تیسری کسوٹی ہے کہ شاعر گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کے غازی نہیں ہوتے۔ وہ اپنے شعروں میں تو اپنے آپ کو رزم کے رستم و اسفندیار اور کوچۂ عشق کے مجنوں و فرہاد کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں لیکن یہ محض لاف زنی ہوتی ہے، عملی اعتبار سے وہ بالکل صفر ہوتے ہیں۔ وہ خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور ان کی ساری رزم و بزم بالکل خیالی ہوتی ہے۔ جن مکارمِ اخلاق کی تعریف میں وہ آسمان و زمین کے قلابے ملاتے ہیں ان پر عمل کرنے کی انھیں کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح اپنی جس رندی کا وہ اپنے شعروں میں اشتہار دیتے ہیں وہ بھی درحقیقت اپنی ہوس کا اشتہار دیتے ہیں۔ عملی اعتبار سے وہ اس میں بھی بزدل ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس پیغمبر کو دیکھو کہ وہ جو کلام پیش کر رہے ہیں اس کا سب سے بڑا عملی نمونہ وہ خود ہیں۔ جس خدا ترسی، جس بندگیِ رب، جس ایثار اور جس قربانی کی دعوت وہ خلق کو دیتے ہیں اس پر سب سے آگے بڑھ کر اور سب سے زیادہ عمل وہ خود کرتے ہیں اور ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ ان کا کوئی قول و فعل سر مو اس کتاب سے منحرف ہے جو وہ لوگوں کو خدا کی کتاب کی حیثیت سے سنا رہے ہیں تو ایک ایسے قدسی صفات شخص کو ان شاعروں کی صف میں کھڑے کرنے کے کیا معنی جن کے اقوال و اعمال میں ادنیٰ مطابقت بھی نہیں ہے!

دربارِ رسالت کے شعراء کا استثناء

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ۭ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ (۲۲۷) یہ اس عام کلیہ سے جو شعراء سے متعلق مذکور ہوا، استثناء ہے اور یہ اشارہ ہے دربارِ رسالت کے شاعروں کی طرف۔ فرمایا کہ یہ لوگ بیشک ایمان کی دولت سے بہرہ مند ہیں۔ ایمان نے ان کی شاعری کا ایک ہدف معین کر دیا ہے اس وجہ سے یہ چوبائی تیر نہیں پھینکتے بلکہ ان کا ہر شعر کلمۂ حق کی حمایت میں اور رفعِ ذکرِ الٰہی کے لیے ہوتا ہے اور

یہ صرف گفتار کے غازی نہیں ہیں بلکہ تقویٰ اور عمل صالح کی دولت سے بھی مالا مال ہیں۔ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا۔ یعنی ان کے کلام میں عشق و ہوس اور مفاخر و مطاعن کے بجائے زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر اور اعلائے کلمۃ اللہ ہوتا ہے۔ وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا، یعنی اگر انھوں نے اپنے شعروں میں دوسروں سے متعلق کچھ کہا ہے تو وہ ہجو نہیں ہے بلکہ اپنے حق کی حمایت و مدافعت میں کہا ہے جب کہ ان پر زیادتی کی گئی ہے۔ ہر مظلوم کو اپنی اور دوسرے مظلوموں کی مدافعت کا حق حاصل ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ۔ جب ان لوگوں کی مظلومی کا ذکر آ گیا تو ساتھ ہی ان ظالموں کے انجام کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو اس ظلم کے مرتکب ہوئے۔ فرمایا کہ ابھی تو ان کے ظلم کی مدافعت زبان سے ہو رہی ہے لیکن عنقریب وہ وقت بھی آنے والا ہے جب یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ یہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں!

ہمارے شعراء اور ان کی شاعری

شعراء اور ان کی شاعری پر قرآن نے یہ تنقید جو کی ہے اگرچہ اصلاً اس کا تعلق جاہلیت کے شعراء اور ان کی شاعری سے ہے لیکن انصاف سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ تنقید ٹھیک ہمارے شعراء اور ان کی شاعری پر بھی منطبق ہو رہی ہے۔ اور یہ بات میں ان عام شاعروں کو سامنے رکھ کر نہیں عرض کر رہا ہوں جو صرف تک بندی کرتے ہیں۔ ایسے شاعروں کی خرافات پڑھنے کا اتفاق مجھے کبھی مشکل ہی سے پیش آیا ہے۔ میں یہ بات ان بلند رتبہ شاعروں کو پیش نظر رکھ کر عرض کر رہا ہوں جن کے شاعر ہونے میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن کی اس کسوٹی پر ان کے کلام کو جانچیے تو مشکل سے گنتی کے چند شاعر ایسے نکلیں گے جو اس کسوٹی پر پورے اتریں گے۔ باقی سب فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ اور يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ کے مصداق اور ان کے مداح اور پیرو بھی انہی کی طرح غَاوٗنَ میں داخل ہیں۔

ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ جو باتیں قلم سے صحیح نکلی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے صحیح نکلی ہیں اور اگر کوئی بات غلط نکلی ہے تو وہ میرے علم کی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ضرر سے مجھ کو بھی محفوظ رکھے اور اس کتاب کے قارئین کو بھی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

رحمان آباد

۲۰ر جنوری ۱۹۷۴ء